شبلی کی حیات معاشقہ

شبلی کی حیاتِ معاشقہ

(نفسیاتی مطالعہ)

وحید قریشی



مکتبہ جدید • لاہور



بار اول ۱۹۵۰

قیمت ۱/۸

پبلشرز ● مکتبہ جدید - لاهور

پرنٹرز ● کواپریٹیو پریس - لاهور

فہرست

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲	۲۲	اولی	اولیں
۱۸	۹	روکد	روک
۲۲	۱۵	بھرۂ	بھرۂ
۲۳	۱۲	چیز	چیزی
۲۴	۱۴	ور	در
۲۷	۹	کنزرو ٹوازم	کنزرو ٹزم
۳۶	۲	پڑا	پڑتا
۴۵	۱۰	حسین	حسن
۴۶	۱۹	۱۹۰۲ء	۱۹۰۶ء
۴۸	۱۸	جزو	جز
۵۰	۵	مرد	برد
۵۰	۹	میخزان	مخزن
۵۲	۱	یقینہ	یقینا
۵۲	۱۵	بہ‌لالہ	بالالہ
۵۳	۴	گزفت	گرفت
۵۴	۵	مٹنے	کٹنے
۵۷	۳	بے	بی
۵۷	۱۲	زا	ز
۵۸	۱۲	رستۂ گل	دستۂ گل
۶۱	۱۵	تفرقہ	تفرقہ

۶۲	۹	یاسبانی	پاسبانی
۶۲	۱۷	بار	یار
۶۲	۲۱	مانی	مانده
۶۳	۱۲	جرو	جزو
۶۸	۱۸	تمہارے نام کر معنون	تمہارے نام معنون
۸۱	۱۵	چھپایا	چھاپا
۹۴	۱۵	فی الھند	فی الھند
۶۵	۱	پا	یا

غلط نامہ میں وہ الفاظ شامل نہیں ہیں جن کے شوشے اور نقطے چھپائی میں اڑ گئے تھے - ایسی جگھوں پر صرف انھی الفاظ کی درستی کی گئی ھے جن سے مفہوم یا زبان میں فرق پڑتا تھا

نوٹ- متن میں دو جگہ عالم السرائر کا لفظ آیا ھے علامہ شبلی کے معاصر مولوی چراغ علی کا بیان رسائل چراغ علی جلد اول میں صفحہ ۱۸۰ پر ملاحظہ فرمائیے کہتے ھیں-

> قال فی القاموس السر بالکسر ما یکتم
> کالسریۃ الجمع اسرار و سرائر و الجماع
> والذکر و النکاح و الافصاح بہ والزنا
> و فرج المراۃ

ابتدائیہ

یہ مقالہ اب سے چار سال اُدھر " حلقہ ارباب ذوق " میں پڑھا گیا تھا - اس کے بعد اسی سال " کتاب " اور پھر " ادبی دنیا " میں شائع ہوا - اب اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے -

اس کی اشاعت سے میرا مقصد بعض نے یہ فرض کر لیا اور اسی پیش خیالی کے ساتھ انھوں نے اس مضمون کا جائزہ لیا اور گمنام خطوط اور دھمکیوں سے اس بات کا اعلان کیا - کہ میں علامہ شبلی کی عظمت کو کم کرنے کے درپے ہوں - میں ان بزرگوں کے خطوط کا کوئی جواب نہیں دوں گا - جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے پہلے کی یہ پود جن کے فتوے مجھ تک پہونچے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی مجبور ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے تمدن کی آویزش میں جس چیز کا پلہ بھاری رہا وہ اخلاق قدروں کی ظاہری پابندیوں سے ایک ان سمجھی اور ان بوجھی محبت تھی جس میں عقل سے زیادہ جذبات کو دخل ہوتا ہے - اس لئے یہ لوگ جھنجھلاہٹ میں حق بجانب ہیں - اب یہ حضرات زندگی کی اس

منزل پہ پہنچ چکے ہیں جہاں اگر کسی اصلاح کی ضرورت ہو بھی تو اُسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس گروپ میں کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ پچھلے گروہ کا منطقی نتیجہ تھے اتفاق سے اُن کی سوجھ بوجھ نے دلائل کا سہارا بھی لینا شروع کردیا ہے۔ لہذا ان کے اقتباسات کا مضمون کے آخر میں جواب دینا مناسب سمجھا گیا ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے شبلی کی حیات معاشقہ سے بڑے خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا اور میرے بیانات کی تائید کی۔ لیکن اُن کی تائید تائید سے آگے نہ جاسکی۔ یہی اس مضمون کا افسوس ناک پہلو ہے جس نے آج مجھے یہ دوبارہ شائع کرنے پر مجبور کیا ہے۔

میں علامہ شبلی کی عظمت کا معترف ہوں۔ اگر آپ مجھے زیادہ مجبور کریں گے تو میں انہیں Genius بھی کہہ دوں گا یہ دوسری بات ہے کہ اس لفظ میں کسی تنقیدی رجحان کا مطلق کوئی پتہ نہیں چلتا۔ میں اُن کی تاریخ دانی کا بھی قائل ہوں میں انہیں ایک واجب الاحترام نقاد بھی تسلیم کرتا ہوں۔ عین ممکن ہے آپ کو مجھ سے اُنکی ان خوبیوں کے سلسلے میں اختلاف ہو۔ وہ ایک شاعر بھی تھے۔ اور یہی میرے مضمون کا نقطۂ آغاز ہے۔

ان کی شاعری پر تبصرے کے دو انداز میرے سامنے تھے

ابتدائیہ

ایک تو یہ کہ میں سلاست روانی - جوش بیان کے
چھوکھٹے لگا کر اسی بے روح تنقید کا مظاہرہ کرتا جسے
حالی اور شبلی کے فوراً بعد آنے والے تاریخ ادب کے
مصنفوں نے پیش کیا اور اپنے احترام کی خاطر اُسے قابل
فخر بھی سمجھا - اس طریق تنقید میں جدت عموماً
یہ ہوتی تھی - کہ غالب کو گوئٹے - نظیر اکبر آبادی کو
شیکسپیئر - اور حالی کو شیخ سعدی سے ٹکرا دیا جاتا
تھا - جس سے لکھنے والے اپنے ضمیر کی ملامت سے تو بچ
جاتے تھے - لیکن تنقید کا میدان ۱۹۴۰ء تک چٹیل رہ
گیا -

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں ان کی شخصیت کے
مختلف پہلوؤں کی روشنی میں ان کی شاعری کا رنگ
دکھاتا - اسی انداز کو میں نے اپنانے کی کوشش کی ہے -
مویدین شبلی کے کردار میں تضاد تو دیکھنے لگ گئے
اور لذت کے پہلوؤں پہ ان کی نگاہیں تو جم گئیں لیکن
شبلی کی شاعری جسے بجا طور پر اس مضمون کے بعد
موضوع گفتگو ہونا چاہئے تھا پس پشت ڈال دی
گئی -
اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ تطاول خم زلف دراز کی
بات حرم سرا کی دیواروں تک پہونچ گئی اور خود
محترمہ فیضی کو میدان میں اترنا پڑا بہر حال "ادیبوں
کے اس مشغلے" کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ عطیہ بیگم

کے رد عمل کا ہمیں علم ہو گیا اور ہم اپنے موضوع کے تمام گوشوں کو بے نقاب دیکھ رہے ہیں - دوسرا فائدہ یہ تھا کہ عطیہ صاحبہ نے اپنے نام علامہ اقبال کے خطوط بھی پبلک کے حوالے کر دئے اور اپنی ذاتی ڈائری شیخ اکرام کے ہاتھ میں دے دی - اس عمر میں ادب کی یہ خدمت گزاری بڑے دل گردے کا کام ہے -

اس بحث میں عطیہ بیگم کے علاوہ شیخ اکرام (شبلی نامہ) عبدالرزاق (یاد ایام) خالد حسن قادری (رسالہ نگار) نیاز فتحپوری (رسالہ نگار) امین زبیری (شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق) قاضی عبدالغفار (اخبار پیام) عبدالماجد دریا آبادی (اخبار اصلاح) مولوی احمد مکی (رسالہ ہماری کتابیں) اور بمبئی کے بعض ہفتہ وار اخباروں نے حصہ لیا - میں ان سب کا ممنون ہوں - اور اس مضمون کی ترمیم میں ان کی نگارشات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے - شیخ اکرام صاحب کا میں خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میری دو ایک تاریخی غلطیوں کی اصلاح فرمائی -

مولانا صلاح الدین صاحب کا بھی شکریہ گزار ہوں جو محترمہ عطیہ بیگم سے ایک ایسا مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بغیر یہ موضوع یقیناً تشنہ رہ جاتا قیوم نظر بھی شکرئیے کے مستحق ہیں کہ اس مضمون کی اولی اشاعت میں انہوں نے نہ صرف میری

ابتدائیہ

زبان بلکہ شرر اور مہدی حسن کے بعض اقتباسات کی
زبان بھی درست فرمائی - یہ میری جہالت ہے کہ میں
ان اقتباسات کو دوبارہ ان کی اصلی حالت میں شائع
کر رہا ہوں -

وحید قریشی

یونیورسٹی لائبریری لاہور
۱۴ جنوری ۱۹۶۹

سوانح نگاری اور علامہ شبلی

شبلی اپنے عہد کی لکھی جانے والی سوانح عمریوں سے مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے خیال میں ان میں ایک طرح کی خیانت اور خداعی سے کام لیا گیا تھا۔ چنانچہ مہدی حسن موازنہ انیس و دبیر سے ناقل ہیں :-

" ہمارے زمانے میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کا یہ عذر کیا جاتا ھے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں - لیکن مذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کرتے ہیں - جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ھے - وہ ایشیائی شخص پرستی ھے جس کا اثر رگ وپے میں سرایت کر گیا ھے اور مذر کرنے والوں کو خود اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک بہت بڑا ضرر ھے"۔

سید سلیمان ندوی مکاتیب میں لکھتے ہیں :-

" انسان کی بڑی سے بڑی سوانح عمری اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا کا اہتمام کیا جائے تو سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت

سے اوراق سادہ چھوڑ دینے پڑیں گے - بیچ بیچ میں
ہفتوں ' مہینوں بلکہ سال ہا سال کے حالات
نا واقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جائیں گے"-
بعینہ یہی احساس مجھے اس مصنف کی کتاب
حیات شبلی پڑھ کر ہوا ہے - دیکھئے مولانا کی پوزیشن
کو کس طرح صاف کرتے ہیں :-

" وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی
ہے وہ غلطی سے اس " دشمن ایمان " کی تلاش
بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں
تھا - یعنی کہ وہ علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہو
کر ندوہ میں شامل ہوگئے - یہ غزلیں رسالوں
میں چھپیں اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں
ہوئیں جو خوش گمان تھے وہ اسے تصوف کے رموز
و اسرار سمجھے اور مولانا سے دست بیعت ہوئے -
اور ان کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں - جو بدگمان
تھے وہ اس وصف عنوانی کے افراد کی تلاش میں
لگ گئے - حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ - بلکہ
صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسن نظرنے ان
کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا - خطوط
شبلی کے اوراق میں یہ سامان نہیں اُن کی
تاریخ دو برس بعد ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے - "
ان الفاظ سے خیال ہوتا ہے کہ سید صاحب مولانا

کی زندگی کے ان واقعات کی نقاب کشائی بھی کریں گے جن کی ابتدا خطوط شبلی سے ہوتی ہے - لیکن اس بارے میں سید صاحب بالکل خاموش ہیں - میرے خیال میں سلیمان ندوی خطوں کو سند مان کر ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء کے زمانے کو پس پردہ رکھنا چاہتے ہیں جو ایک ادبی خیانت سے کس طرح کم نہیں - مولانا نے اس مسئلے پر خط و کتابت اس وقت شروع کی جب انہیں اسکی ضرورت لاحق ہوئی - لیکن بر خلاف اس کے انہوں نے شعر صرف اس وقت کہے جب " کافروں " کا کرم شامل حال ہوا -

در اصل شبلی جیسے مذہبی خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں - مانی جانے والی بات نہیں - شبلی کے طرفداروں کے نزدیک تو ان باتوں کا ذکر ہی لا حاصل ہے - کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کا تعلق شبلی کی ادبی زندگی سے مطلق نہیں - ہم سمجھتے ہیں کہ صرف اسی ایک خیال نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کو ہماری نظروں سے بہت حد تک اوجھل رکھا ہے -

سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۷ء میں مکاتیب شبلی چھپوائی تو حصہ دوم کے دیباچے میں لکھا ہے :-

> " آخر میں مجھ کو خطوط کے انتخاب میں جو اصول مرعی رہا اس کو بھی ظاہر کر دینا

چاهے - میں نے صرف ان خطوط کو انتخاب کیا هے
جن سے یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقع
ظاهر هوتا هے یا اُن میں کسی علمی - اصلاحی
اور قومی مسئلے کا ذکر هے یا انشاپردازی کا اُن
میں کوئی نمونه موجود هے - انهیں اصول ثلثه کی
رهبری میں هزاروں خطوط کے انبار سے یه چند
دانے چھانٹ کر الگ کئے گئے"۔

اس سے معلوم هوتا هے بهت سے خطوں کی اشاعت
روک دی گئی تهی اور یاد رهے که ان اصول ثلثه میں
سے پهلا اصول سید صاحب نے محض زیب داستاں کے
لئے رکھا هے - کیونکه جب مهدی حسن صاحب نے
لکھا که " میرے نام کے خطوط کا کوئی حصه الگ نه
کیا جائے - " تو وه اس کو کسی عنوان نه ٹال سکے - اس
سے اس امر کا پته بهی چلتا هے که مهدی حسن کو
سید صاحب کی افتاد طبع کا حال معلوم تها - صرف
یهی نهیں مهدی حسن نے ایک مضمون بهی لکھ
بھیجا جسے مرتب کو دیباچے میں جگه دینے کے سوا
کوئی چاره نه تها - چنانچه اس میں لکھا هے :-

" بهر حال خطوں میں (شبلی) نسبتا
کم کھلتے تھے - لیکن مجھ پر (مهدی حسن پر)
خاص عنایت تهی - اس لئے راز نهیں رکھتے تھے -
تا هم تصریحات کی جگه آپ دیکھیں گے "چشم

سخن صرف اشاروں سے کام لیتی ہے - میں اس
لطف کو کھونا نہیں چاہتا - اور یہی وجہ ہے کہ
بعض مقامات پر تصریح طلب نکتوں کی بے نقابی
میں نے جائز نہیں رکھی - "

اس کے ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ "مولانا نہایت خوش
ترتیب تھے - اونچے طبقے کی سوسائٹی میں بہت
مانگ رہتی تھی - جہاں وہ کہیں سے بیگانے نہیں ہوتے
تھے - ملک کے بعض اونچے خاندانوں سے مخلصانہ
روابط تھے - ان میں بعض لیڈیاں نہایت شائستہ قابل اور
مذاق ادب کی دلدادہ تھیں ان کو بھی خط لکھتے تھے
تو اس طرح جیسے سرکاری گزٹ ! بہت ہوا دعائیں
لکھ دیں - ایک کو لکھا کہ کچھ نہیں - میں نے عرض
کیا مولانا مقصود بالذات تو وہی تھی - یہاں بھی امتیاز
رہا - سن کر پھڑک گئے اور میرے انتقال ذہن پر بہت
خوش ہوئے - "

جب یہ بیانات چھپے ہونگے تو ملک میں شبلی
کے دشمنوں نے بہت سی افواہیں پھیلانا شروع کی ہوں
گی - اس لئے کہ جب مہدی حسن نے ۱۹۱۸ء میں
شبلی سوسائٹی کی تجویز پیش کی اور ایک طویل
مضمون لکھا تو اپنی طرف سے ان الفاظ میں صفائی
پیش کی :

بمبئی کی نازک خیالیاں گویا میری جوانی کے قصے ہیں

جو مولانا کی زبان سے ادا ہوئے - آپ داد دیں نہ دیں "
شاعر کو اس کا بالکل احساس نہیں - اس کا عالم خیال
خود ایک دنیا ہے - ذرا جذبات کا تموج دیکھئے گا -
سمندر کے کف سے پری نکلی لیکن بالکل عریاں جسکے بالوں
سے قطرات آب موتی کی طرح ٹپک رہے ہیں - اس کے
نازک ہاتھ میں ایک ساغر شراب ہے - وہ شاعر کی طرف
بڑھتی ہے - عنبر بکھیرتی ہوئی یا قوتی ہونٹوں پر ایک
معنی خیز تبسم ہے نازک خیالی جس کی بلائیں
لے رہی ہے - "

دیکھئے کس صفائی سے سارے الزام کو اپنے سر لیا ہے
یوں تو مہدی حسن کے ان متضاد بیانات ہی سے
ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے - لیکن پھر بھی ہم
اس سلسلے میں شبلی کا ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کا خط بنام
ابوالکلام آزاد پیش کرتے ہیں :-

" افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی
لائف لکھ کر حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں -
میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ
سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا
ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوا لیجئے - بتاتو نہ
دو گے ؟ "

سلطان حیدر جوش اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے
ہیں :

" اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی کھلی اور ڈھکی ہر طرح کی زندگی سے مولانا ابوالکلام آزاد خوب واقف تھے - اس تحریر کے آخری جملے میں ایک دفتر پنہاں نظر آتا ہے " -

مزید تسلی کی ضرورت ہو تو ظفر الملک علوی (مرحوم) کا بیان ملاحظہ ہو - الناظر کے اس مدیر نے جب ۱۹۱۰ء میں شبلی کی ایک نظم چھاپنے کی اجازت چاہی تو مولانا نے جو جواب انہیں دیا وہ انہیں کی زبانی سنئے - کہتے ہیں :

ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا شبلی کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی - لیکن جب مولانا سے ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے بہ اصرار اس سے باز رکھا - بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے - یہ اشعار اتفاق سے تلف ہو گئے ورنہ اب ان کی اشاعت کا اچھا موقع تھا - ایک شعر جو رہ گیا ہے وہ متفرقات میں ملے گا " -

متفرقات میں یہ شعر ہے -

نشہ آور تھی نگاہ چشم ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

علامہ شبلی کی حیات معاشقہ

اور نیچے فٹ نوٹ لکھا ہے "جن گم شدہ اشعار کا ذکر گذارش میں ہے ان میں یہ شعر یاد رہ گیا ہے اور درج کر دیا گیا ہے۔" خوش قسمتی سے یہ پوری نظم خطوط شبلی میں ص ۸۳ پر موجود ہے۔ مولوی احمد مکی صاحب لکھتے ہیں۔

شبلی نعمانی کی حیات معاشقہ کوئی راز کی بات نہیں رہی ہے۔ آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میرے استاد مولوی محمد مہدی صاحب مرحوم مجھے تمام تفصیلات سنا چکے تھے۔"

مولانا حسرت موہانی کو بھی شک ہوا تھا۔ چنانچہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی حسرت سے ناقل ہیں:

"علامہ شبلی انکار کئے جائیں لیکن ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شیوۂ دلپذیر کو وہ "تہمت دوستان" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعرانہ طبیعت بہرۂ وافر رکھتی ہے۔ اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

گردم از مدحت شیراز و صفاهاں زدہ ام
شرم بادم کہ نواهائی پریشاں زدہ ام
بمبئی بود مرا منزل مقصود عبث
این بیش ازیں گام طلب دررہ حرماں زدہ ام
اند کی نیز بہ کام دل خود بین باشم

روز گاری چو دم از دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ توان کردسخن فاش بگو
سنگ برشیشۂ تقویٰ زدہ‌ام هان زدہ ام
جامۂ زهد چو بر قامت من راست نبود
شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سندان زدہ‌ام
آن شدای دوست کہ آراستمی پیکرفن
نقش زیبا صنمی بروری جان زدہ‌ام
آن شدای دوست کہ درندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آن دشمن ایمان زدہ‌ام
هان وهان دست بد اریدزمن ای احباب
کہ بہ زیباصنمی دست بہ پیمان زدہ‌ام
پی‌توان برد کہ‌این زمزمہ بی چیزنیست
شبلی این تازہ نواهانہ چومستان زدہ‌ام''

شبلی ایک جگہ کہتے ہیں :

شبلیا نابلد کوچۂ عشقیم ولی
دوستان تہمت این شیوہ بہ مانیز کنند

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل ودین باخت
این حرف ولی مصلحت آمیز نبوداست ۔

شبلی اگر اپنا راز چھپاتے ہیں تو مصلحت کی بنا پر ۔ وہ عوام سے ڈرے تھے ۔ اس لئے اول تو اردو میں عشقیہ شعر کہنے سے پرہیز کیا جو ایک آدھ نظم کہی

اسے چھپنے نہ دیا - فارسی میں انھوں نے حال دل کہہ ڈالا کہ خواص تک محدود تھی -

اب ذرا مولانا کے اس سوانح نگار (حیات شبلی بشیر پاشا سیریز) کا بیان ملاحظہ ہو جو جا و بے جا مولانا کی طرفداری کا دم بھرتا ھے :

مولانا نے ایک خاتون کی تربیت کرنا چاھی تھی اور ان کی تمنا تھی کہ یہ خاتون بہت بڑی مقرر اور لیکچرار ھوجائے لیکن مولانا کی نظر محبت نے غور سے مطالعہ نہ کرنے دیا - ورنہ ان کو معلوم ھو جاتا کہ جس منصۂ کمال پر وہ اُسے لانا چاھتے ھیں - اس کے خلاف میلان طبیعت دوسرے اسٹیج کی طرف ھے :

جاں کشاید سوئے بالا بالہا
ور زدہ تن در زمین چنگا لہا

میں نہیں کہہ سکتا فاضل سوانح نگار کا اشارہ دوسرے اسٹیج سے کس بات کی طرف ھے اور وہ اس موقع پر کیا کہنا چاھتے تھے تاھم قارئیں سوچیں کیا اس سے کوئی بات نکلتی ھے ؟ شائد اقبال کے خطوط بنام عطیہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں ! -

حالات زندگی

شبلی کے عشق کو ہم ایک اتفاقی حادثہ ماننے کے لئے تیار نہیں - اسلئے کہ اس قسم کے حالات پیدا ہوگئے تھے جو اس امر کے مقتضی تھے کے شبلی کو ایک فرار کی ضرورت محسوس ہوئی انسانی مزاج کے بنانے اور ڈھالنے میں ماحول کا بڑا ہاتھ ھے - دیکھنا یہ ھے کہ شبلی کی شخصیت کن ادوار سے گزاری - انہوں نے ہر دور سے کیا اثر قبول کیا اور ہمبئی پہنچتے پہنچتے ان کی طبیعت نے کون سا رنگ اختیار کیا - اس لئے ہمیں انکی تمام گذشتہ زندگی کو دیکھنا ہوگا -

علامہ شبلی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے - گھر میں ان کی یہ پوزیشن اُن کے طرز حیات کی طرف کھلا اشارہ کرتی ھے - لیکن ان کی نشوونما ایک سید ھے خط میں نہ ہوسکی - اسلئے اُن کے (Character Trait) میں ہمیں ظفرمندی کے وہ آثار نہیں ملتے جو انہیں امن و اصلاح کا محافظ بنا سکتے - انکی زندگی ایک مستقل جدوجہد رہی جس میں فتحیں کم اور شکستیں زیادہ تھیں - اپنی ان شکستوں کا شمار وہ ابتدائے حیات سے سے کرتے رہے ہیں - اسلئے اگر ان کی نرگسیت کو ایک

ٹیڑھا خط تصور کیا جائے تو بے جانہ ہوگا -

اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ان کے تعلقات شروع ہی سے کچھ اچھے نہیں رہے - اور امتداد زمانہ کے ساتھ نفرت زیادہ نمایاں ہوتی گئی -

انکی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی - اس کے بعد باپ کی توجہ انگریزی کی طرف ہوگئی اور ان کے چھوٹے بھائیوں کی تربیت کا طرز انگریزی ہوا - اس میں انہیں اپنے بھائی میں عظمت کے وہ آثار نظر آنے لگے جن میں علامہ کو اپنی شکست نظر آئی تھی - مہدی کے ولایت جانے نے تو ان کے " غم وغصے کو اور گہرا کر دیا تھا" ۱۸۷۹ء میں مہدی نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا اور شبلی اس میں بھی فیل ہوگئے -

واقعات کی ان کڑیوں سے نرگسیت کی اس اعصاب زدہ ہیئت کی بنیاد پڑ گئی جو بعد میں طرح طرح سے ظاہر ہوئی - وہ شدید احساسات کے انسان ہوگئے " جس چیز کے حق میں ہوتے اُسے آسمان پر پہونچا دیتے اور جس کی مخالفت شروع کرتے بعض اوقات اعتدال اور انصاف سے آنکھیں بند کر لیتے "-

اس ابتدائی زندگی میں ہمیں ان کے کردار کا ایک اور خط واضع طور پرنظر آتا ہے - وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی تھی - جس سے وہ اپنی ماں کے طرفدار ہوگئے تھے اور بعض اوقات تو

انھیں اپنے والد کے خلاف کلمے بھی کہنے پڑے - ایک عرصے تک (باپ کی وفات تک) باپ بیٹے کے تعلقات کشیدہ رہے۔ "انھیں اپنی ماں سے محبت تھی" ان کی والدہ کی موت سوتیلی ماں کی آمد کے غم ھی سے ہوئی - اس لئے شبلی نے تمام عمر سوتیلی ماں سے بات نہ کی اور باپ سے نفرت کرتے رھے -

ماں کی محبت ان کے کردار کا ایک خاص پہلو ھے - باپ کی مخالفت اور بھائی کی مخالفت انھیں دو انتہاؤں میں علامہ شبلی تمام عمر بھٹکتے رھے - تا ھم ان کے لئے سب سے اھم خود ان کی ذات ھو گئی - شبلی کی نرگسیت اپنے اندر انتہا پسندی اور کنزر و ٹوازم کے آثار لئے ہوئے ھے - اور اس مرکز سے ان کی زندگی کا ھر گوشہ صاف دکھائی دیتا ھے -

"مولانا نے جن درس گاھوں میں تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا ان کی صحبت نے ابتداھی میں انھیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا لفظ لکھنا شروع کر لیا - جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انھیں اپنی غلط فہمی کی بنا پر نسباً نعمانی یعنی امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کی نسل میں خیال کر لیا مگر اس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ھے - وہ متشدد حنفی تھے - اور حنفیت

میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے - اس جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انہوں نے سیرۃ النعمان لکھی اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے -''

اس وقت تک ''مولانا نے جس فضا میں پرورش پائی تھی اس کا اقتضا یہ بھی تھا کہ مقلدی اور غیر مقلدی کی معرکہ آرائی میں مولانا بھی نبرد آزمائی کریں - مولانا خود حنفی تھے اور مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور مولوی احمد علی کی شاگردی نے جوشیلا حنفی بنا دیا تھا -

چنانچہ غیر مقلدی کی تردید میں مولانا نے خوب زور قابلیت صرف کیا - وہابیت کی تردید میں کئی رسالے اردو فارسی اور عربی میں لکھے''-

''اس زمانے میں مولانا لڑکوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے وہ اس وقت تند مزاج مولوی کے مکمل نمونے تھے تارکین صلواۃ پر انتہائی تشدد کرتے - بعض لڑکوں کو دو دو گھنٹے تک اس لئے پیٹا کرتے کہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں ''-

ان آخر کے جملوں کو ذرا ذہن میں رکھئے کیونکہ اپنی شخصیت منوانے کا یہ جذبہ جو اس کی تہ میں کام کر رہا ہے - آگے چل کر مولانا کی زندگی میں مختلف شکلوں

میں نمایاں ہو گا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے گاؤں میں زمینداری شروع کی لیکن یہ درد سر کہاں اور مولانا کی مولویت کہاں۔ چھوڑتے ہی بنی۔ پھر مولانا وکیل ہوئے۔ لیکن یہ پیشہ اور اس کی چالیں مولانا کو مناسب نظر نہ آئیں اور محکمہ امانت میں ملازم ہو گئے۔ "یہ زمانہ رمضان کا تھا۔ لیکن مولانا دیانتدار اور فرض شناس آدمی تھے اس لئے شدید گرمی میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرا کرتے۔ روزہ منہ میں ہوتا تھا مگر فرض مستعدی سے ادا کرتے تھے۔"

ایک مہینہ جوں توں کرکے بسر ہوا اور آخر مولانا نے نوکری چھوڑ مصلے میں پناہ لی۔

جس شدت سے مولانا پر مذہبی رنگ چڑھا تھا اسی شدت سے علی گڑھ آنے کے بعد اس کا رد عمل شروع ہوا۔ سرسید کی تحریک نے ملک میں ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ مولانا بھی اس گروہ میں شامل ہوئے اور خوب داد شجاعت دی۔ کہیں پینی ریڈنگ کے جلسے میں قصیدہ پڑھا۔ کہیں مثنوی صبح امید اور سرسید کے قومی تھیٹر کے مسدس کی بنیاد ڈالی۔ (جس کے ساتھ قومی نظمیں پڑھنے کا ایک خاص انداز رائج ہوا)

"اس موقعے پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کردینا بھی لطف سے خالی نہ ہو گا۔

سرسید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں تھے - لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انہیں معتزلی بنا دیا تھا ... سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا - مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی - وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انہیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی - لہذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ رنگ بھی چڑھنے پائے وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں''۔

علی گڑھ کے طلبا میں ''شبلی عموماً غیر ہردل عزیز تھے۔ ان کو طلبا خشک اور مغرور سمجھتے تھے - '' اس کے علاوہ وہ علی گڑھ کے قیام میں نرگسیت نے بعض اختلافی صورتیں بھی اختیار کیں - ''سید صاحب کی صحبت - علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور اُن کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس (متعارف) کروایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں - خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمرکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی حاصل ہو گئی - مگر خود مولانا شبلی کی خود داری اس حیثیت

کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی"۔

چنانچہ بقول مہدی حسن جب انھوں نے علم الکلام لکھی تو سرسید کا نام تک نہ لیا۔ حالانکہ علم الکلام کے سلسلے میں سرسید نے جو خدمات سر انجام دی ھیں وہ ایک مانی ہوئی بات ھے۔ مہدی حسن کے اصل الفاظ یہ ھیں:

"یہ غور طلب ھے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا"۔

"اپنی اُن تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ھی اپنی اس حیثیت (یعنی سرسید کی طرفداری) کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کرکے ندوۃ العلما میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعے سے میں علما کا سر تاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے تک پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ھے"۔

سرسید کی صحبت سے شبلی کے سخت دینی عقائد لچیلے ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ھیں کہ شبلی کی اپنی شخصیت منوانے کی خواھش ایک طرف

تھی اور سرسید کی انگریزی تعلیم کا اثر دوسری طرف۔ ایک طرف وہ پرانی تعلیم کے حق میں تھے اور دوسری طرف قدیم تعلیم کی ابتری سے بیزار بھی تھے۔ چنانچہ ندوۃ العلما میں انھوں نے جو تحریک چلانی چاہی وہ یہ تھی کہ "عربی کی مکمل تعلیم اور انگریزی بقدر ضرورت"۔

ایک طرف مولانا روشن خیال تھے تو دوسری طرف سرسید کے برابر پوزیشن حاصل کرنے کا خیال۔ ایک طرف حصول جاہ کی خواہش نے ندوہ کے بکھیڑوں میں ڈال دیا اور دوسری طرف آزاد خیالی نے اور ہی گل کھلائے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شبلی میں کوئی تضاد یا ثنویت تھی۔ کیونکہ انکی نرگسیت ان کے دینوی مشاغل۔ علمی مشاغل۔ شاعری۔ اور عورتوں کے عشق۔ لڑکوں کے عشق سب میں کارفرما نظر آتی ہے اور کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ سب کا عمل ایک ہی ذہنی اُفق کا کرشمہ ہے۔

اس وقت علامہ کا رجحان یہ تھا کہ وہ سرسید کے برابر نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ اس تعلق کو جو انھیں سرسید سے تھا اور جس سے وہ ادبی نیز سیاسی محفلوں میں متعارف ہوئے تھے اپنے آپ کو الگ کر کے ظاہر کرانا چاہتے تھے۔ تیسرے ان کی طبیعت جس پر ان کی تعلیمی دلچسپیوں کا اثر تھا اپنے نظام میں دینی

رجحانات کو زیادہ جگہ دینا چاہتی تھی - اس کی ایک صورت یہی ہوسکتی تھی کہ وہ اس گروہ کی حمایت حاصل کریں جو مشرق وسطی کی سیاسی تبدیلیوں کے زیر اثر عام مسلم بیداری کی شکل میں ابھر رہا تھا -

یہ ان کے مشاغل کا ایک دائرہ تھا جس میں وہ مجلسی مقام اور لیڈری کے خواہاں تھے - دوسری طرف ان کی نرگسیت جس سے تنگ نظری کا غلاف سرسید کے زیر اثر اتر چکا تھا ' حسن و عشق کی رنگینیوں میں راستہ تلاش کر رہی تھی - اس رجحان کے ابتدائی آثار قیام حیدر آباد اور اسکے بعد اعظم گڑھ میں نظر آتے ہیں - جس کے تین مرکز تھے ایک ابوالکلام کی ذات دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے مدر اس کی کوئی ہستی (اس کی تفصیلات ابھی منظر عام پر نہیں آسکیں) - البتہ ان دو طرح کے عشقوں کی نوعیت میں اتنا فرق ضرور ہے کہ لیڈرانہ مواقع اور قومی و ملی کاموں میں اس کا اہم عنصر جاہ کی خواہش ہے اور افراد کی صحبت میں خاص پہلو جنسی ہے اگرچہ دونوں کا محرک قوی اپنی ذات ہے -

جب مولانا حیدر آباد گئے - تو یہ زنجیریں (دینی عقائد کی) اور ڈھیلی ہو گئیں - اب وہ داغ وغیرہ کی صحبت میں غزل سرائی کرتے - گاہے گاہے بمبئی بھی جاتے لیکن اسی زمانے کے مشاغل رنگیں کسی صراحت سے صفحہ قرطاس پر ثبت نہیں ہوئے - اس لئے ان کی

نسبت جو کچھ لکھا جائے گا وہ قیاس آرائی سے زیادہ نہیں - بعض خطوط میں مبہم اشارات ہیں جو خدا معلوم کس بات کی نسبت ہیں - ایک خط میں نواب حبیب الرحمان شروانی کو جو ان کے محرم راز اور دوست تھے لکھتے ہیں -

"مدراس ضرور تشریف لائیے مجاز قنطرۃ الحقیقت ہے"

اس کے کوئی تین چار ہفتے بعد جب مولانا شروانی مدراس ہو کر واپس گئے اور وہاں سے شاید ان مشاغل مدراس کی نسبت کچھ لکھا تو شبلی جواب میں کہتے ہیں :

"میں نے مدراس میں نئی وادی میں قدم نہیں رکھا - بلکہ یہ پرانا کوچہ تھا جس کی مدتوں خاک چھانی ع باہم از مستان این می بودہ ایم - زمانہ کے ہاتھوں دوسروں کے لئے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی تھی :

"از ہماں بزم کہ جز من دگری راہ نداشت
بایدم رفت کہ بر دگراں جا باشد"

ہو سکتا ہے - اِس کا اشارہ انہیں خاتون کی طرف ہو جن سے مولانا ۱۹۰۰ کے قریب اپنی پہلی بیوی کی وفات پر شادی کے خواہاں تھے - اور جس کی تفصیل امین زبیری صاحب نے یوں بیان کی ہے :

" بیوی کے انتقال کے بعد انہی حکڑ بندیوں

کے خوف سے انہوں نے عقد ثانی نہیں کیا اور
جب بزرگوں اور دوستوں کے مجبور کرنے پر
راضی ہوئے تو خاندان کی قید کو توڑ کر مولانا
محمد علی مرحوم ناظم ندوہ نے اپنے ایک ہم سبق
دوست کی لڑکی تجویز کی جس کو خدا نے صوری
و معنوی خوبیاں عطا کی تھیں اور جس نے
فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی - لیکن
مولانا ہی کے احباب میں ایک ذی ثروت و مرتبت
دوست اس جنس نفیس کے خریدار بن گئے "

بہر حال روئے سخن جس کسی کی طرف بھی ہو مولانا
کی دوسری شادی ۱۹۰۰ ھی میں ایک خاتون سے ہو گئی
جو انہی خاتون کی طرح عمر میں مولانا سے بہت چھوٹی
تھیں - اتنی چھوٹی کہ مولانا اس بات پر راضی تھے کہ
شادی کے بعد کچھ وقت مجردی میں گزار دیں -

معلوم نہیں انہوں نے شادی کے بعد کا زمانہ مجردی
میں گزارا یا نہیں - یا اپنے ڈاکٹر مصطفیٰ خان صاحب
کے مشورے پر عمل کیا ہو - تاہم یہ خاتون ۱۹۰۵ء میں
چل بسیں اور مولانا پھر خالی رہ گئے -

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور عطیہ بیگم سے
بیک وقت محبت کا آغاز ہوتا ہے - جس کی تفصیل اگلے
صفحوں میں آئے گی - فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہو گا -
کہ مولانا کا مزاج ان دنوں بڑا رومانی تھا - ندوے کے

چندے کی خاطر اور بعض دوسرے کاموں کے لئے مولانا کو اب بمبئی بھی جانا پڑا تھا - چنانچہ ان کے کلیات سے پتہ چلتا ہے کہ ستمبر ۱۹۰۶ء کو وہ بمبئی میں تھے - اب حد سے بڑھے ہوئے مذہبی شغف کے بادل چھٹ چکے تھے اور مولانا بمبئی اور اس کے کاروان ہائے عشق کو آنکھیں کھول کر دیکھ سکتے تھے - بمبئی اور اس کی رونقیں اکثر مولانا کو گرمیوں میں وہاں کھینچ لے جاتیں - "چنانچہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک مولانا نے جو غزلیں کہیں ان کا محرک شہر بمبئی کا قیام تھا - وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور دلکش نظارے دل آویز تفرج گاہیں اور اس سے بڑھ کر وہاں کی رنگین اور دلچسپ صحبتیں یہ سب محرکات ایسے تھے کہ جنھوں نے ان کی شاعری کے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا - ان کے تغزل کا دور صحیح معنوں میں اس بلدۂ حسن و موسیقی اور اسی دیار حسین و رنگیں سے شروع ہوتا ہے" - چنانچہ ستمبر ۱۹۰۶ء کے تاثرات ملاحظہ ہوں -

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا
طراز مسند جمشید و فر تاج خسرورا
بہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بی پروا
گذشتن از سر راہ مشکل افتاد است رہرورا
فغان از گرمیٔ ہنگامہ خوبان زر دشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضورا

"بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت"
کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالورا

شبلی کے عشق کا جہاں تک اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے اس کی نوعیت کم و بیش جنسی ہے - یہی وجہ ہے کہ قاضی احمد میاں جونا گڑھی کو کہنا پڑا کہ اُن کی غزلیں گرما گرم ہیں اور حالی یوں گویا ہوئے :

"کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃالنعمان الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں - غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے - غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں بہت زیادہ گرم ہیں - "

چنانچہ ستمبر ۱۹۰۶ء میں لکھے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں -

مست و پر عربدہ تنگش بکشم در آغوش
تشنۂ وصلم و تاکی بہ محابا باشم
من فدای بت شوخی کہ بہ ہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
گوئیا دشمن ہم از ذوقش نصیبی بردہ است
بادۂ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود

درچہ من مرد ھوسناکی و رندی نیستم
این چنیں ھم گاہ گاھم اتفاق افتادہ بود

خیال بوسۂ آن لعل نوشیں دوش می بستم
ھنوز م لب ز ذوق آن شکر بار است پنداری

اور پھر ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء کو الہ آباد میں بیٹھے ہوئے تو اُن کے ذھن نے کمال ھی کر دیا ھے :

شب وصل است حیاگر بگذاری چہ شود
یک دمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
تو بدین حسن تونگر چہ زیاں برداری
این دو بوسہ تو اگر خود نشماری چہ شود
از تو ناید گرہ بند قبا وا کردن
اگر این عقدہ بمن باز سپاری چہ شود

یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ھوگا کہ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ھی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ھی سے نمایاں تھا - ھم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ھوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ھیں - کہ یہ اشعار سوچ بچار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ھیں اور اُن کے تخیل کی بے باکی پر دال - ورنہ وہ تو خود کہتے ھیں -

غمگیں مباش گر سخن از مدعا نرفت

شبلی ہنوز اول راز و نیاز بود ۔۔ ''

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنی عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا راز عشق افشا کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی :

محتسب دست بد امان من و من سرمست
دست در دامن آن شوخ خود آرا باشم
دامن عیش ز دستم نہ رود تا شبلی
دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم

بلکہ اپنے عشق کی ابتدائی منزلیں کامیابی سے طے کرنے پر بھی ان کو ''تسلی نمی شوم'' کا گلہ رہا ۔

دریافتم کہ مستی ذوق وصال را
این نشہ ہم زحوصلۂ مازیاد نیست

جب تک یہ سلسلہ قائم رہا ان کے اشعار میں مستی اور والہانہ پن موجود رہا ۔ جب تک بمبئی اور اس کے قرب و جوار میں رہتے ۔ عمدہ شعر نکالتے ۔ لیکن جب لکھنئو جاتے تو کچھ نہ کہہ سکتے ۔

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی شدم رند غزلخوان نیستم

یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا عشق کامیاب ہو چکا تھا ۔ بمبئی آتے تو مس عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا لیکن سرسید بننے کی خواہش انہیں کب دم لینے دیتی تھی ندوہ کے خشک کاموں میں الجھتے اور بری طرح

الجھتے - اور ایسے وقت میں شعر کیا خاک ہوتے -
۲۶ نومبر ۱۹۰۸ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں :

بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہاں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ ندوے کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کردیا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی فائدہ * نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشمکش تھی ورنہ آپ بھی دیکھتے جو میں کہتا ہوں " -

ایک خط میں ۱۸ فروری ۱۹۰۸ء کو مولانا حبیب الرحمان شروانی کو لکھتے ہیں :

" عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کی گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا - بہاول پور کے عہدے داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کہ معائنہ کو آتے ہیں - اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے - بالکل ایسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے عدن کو خیر باد کہا تھا - "

اس کے بعد پھر ۲۶ فروری کو لکھتے ہیں :

---

* معلوم نہیں مرحوم کی فائدے سے کیا مراد تھی - ؟

اب کے بمبئی میں عجیب صحبتیں رہیں
لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی فوری ضرورت
سے یہاں آنا پڑا - لیکن آنکھوں میں اب تک
وہ تماشا پھر رہا ہے خیر اس پر فخر کرتا ہوں
کہ دل کی خواہش کو قوم اور مذہب پر نثار کر
سکتا ہوں - اور بے تکلف کر سکتا ہوں -

مولانا کی دوہری محبت بڑی مرکب سی ہے ندوہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد میں دلچسپی اور پھر عطیہ بیگم کے ساتھ لگاؤ - آزاد کی محبت اور اس کے ساتھ ہی عطیہ بیگم سے محبت - عطیہ کے عشق کی تفصیل بھی دلچسپ ہے اگر ایک طرف انہیں ندوہ عزیز ہے تو دوسری طرف عطیہ لیکن آپ دونوں کو ساتھ ساتھ چلانا چاہتے ہیں - ایک طرف ان کے اشعار سے جنسیت کی بو آتی ہے تو دوسری طرف وہ وہ عطیہ کے ساتھ جانماز کا تعلق پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں کبھی اُسے دینی باتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں کبھی حج کی تلقین کرتے ہیں -

اسی سارے بظاہر تضاد کو اگر اب اس زاویہ سے دیکھیں جس کا اظہار کیا جا چکا ہے تو شبلی کی شخصیت میں ہمیں کوئی تضاد کوئی ثنویت نظر نہیں آتی - ان کی نرگسیت ایک لڑکے میں اپنا بدل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے - اور اس طرح ایک

مردانہ صفات کی عورت ان کی محبت اور شاعری کا موضوع بنتی ہے - یہی ان کی روداد محبت ہے اور یہی ان کی نرگسیت کا سیل فراواں جو بیک وقت ندوے کے ریگذاروں میں بھی بہتا ہے اور عطیہ کے دوپٹے اور ابوالکلام کی دستار کو ایک لڑی میں پروتا جاتا ہے -

ابوالکلام آزاد تذکرے میں لکھتے ہیں :

"گمراہئی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد - سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا خانۂ اعمال خالی رہا ہو - اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے -

جو پرسش گنہم روز حشر خواہد شد
تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ ہم خود اپنے آپ ہی شاہد بن جائیں ..."

ابوالکلام کا یہ اقرار بجائے خود ان کی سربلندی کا باعث ہے - لیکن جانے وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت اپنے افعال کو "فسق و فجور" مانتے ہوئے انہیں مجاز سے حقیقت کا راستہ کیوں بتاتے ہیں - دیکھئے صفحہ ۳۰۹ پر لکھتے ہیں :

" ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے

زھد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو۔ تو ہم کو اپنی رندی و ھوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں - جس کو ہیں اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنون شباب کی سر مستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اسطرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا - کوئی صاف راہ پر دوڑ گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی - لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا - کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں - ولولوں ' امنگوں ' امیدوں ' تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے جب کہیں جاکر اس کوچے میں دم لے سکے جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں :

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

اس سے تین نتائج اخذ ہوتے ہیں اول یہ کہ فسق و فجور کا زمانہ اکیس بائیس سال کی عمر سے ہے۔ ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اس لئے اندازاً یہ دور ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کے قریب ہونا چاہئے - لیکن کیا ضرور ہے کہ اسے آخری اور قطعی تاریخ سمجھ لیا جائے - مولانا شبلی سے * ان کی خط و کتابت کی ابتدا اس وقت

---

* ابوالکلام آزاد کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ ۱۴ سال کی عمر میں ان کی خط و کتابت شبلی سے ہوئی اور پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۴ میں ہوئی -

ہوئی جب آزاد کی عمر ۱۷ سال کی تھی ۱۹۰۹ء تک کے اس خلا کے بارے میں شیخ اکرام لکھتے ہیں :

"اس کے بعد ساڑھے تین سال کا وقفہ ہے پتہ نہیں اس دوران کے خطوط محفوظ نہیں رہے یا کسی مصلحت کی بنا پر ان کی اشاعت روک دی گئی -"

سید سلیمان ندوی کی مصلحتوں کا ذکر اس مضمون کے شروع میں ہوچکا ہے - شیخ اکرام مرنجاں مرنج آدمی ہیں اس لئے اصل بات دبے لفظوں میں کہہ گئے ہیں - اسکی تائید اس تیسرے خط سے ہوتی ہے جس کا حوالہ خود صاحب شبلی نامہ نے دیا ہے -

"ازاں کہ درد دگر ہر زمان گرفتارم
کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

بھائی ! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کردی کہ الیاس احدی الراحتین لیکن تم رہ رہ کر ایک چر کا لگا دیتے ہو - خیر جو مرضی یہ بھی منظور!! کلکتہ گیا - ایک خاص کام تھا ...... دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں - لیکن ع

چہ حظ خضر برد از عمر جاودان تنہا"

دوسرا نتیجہ تذکرہ کے محولا بالا ٹکڑے کے آخری شعر سے ہوتا ہے جس سے صاحب تذکرہ اور شبلی کے تعلقات کی

صحیح نوعیت پر روشنی پڑتی ہے - تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے افعال کی مجاز و حقیقت والی توجیہات کے قائل ہیں -

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا شبلی نے ابوالکلام میں اپنی ذات کا عکس دیکھا تھا - یہی وہ نرگسی الجھاؤ ہے جسے ممتاز حسین صاحب نے غبار خاطر پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوالکلام میں دکھایا ہے - عقلی طور پر آزاد اس روداد محبت کو فسق و فجور مانتے ہیں لیکن اسی اہانت کو چھپانے کے لئے جو اسی انداز کا لازمی نتیجہ ہے جس کی طرف آخری شعر نے اشارہ کیا تھا وہ اپنے مادی عشق کو بیک وقت فسق و فجور اور مجاز سے حقیقت کا راستہ بتاکر بری الزمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں -

اس موقعہ پر یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مولانا شبلی کی دوسری بیوی کی وفات ۱۹۰۵ء کے قریب ہوگئی تھی -

تاہم کیا ہم جنس اور شہوانیت کو ہم معنی سمجھ سکتے ہیں - میرا خیال ہے ہرگز نہیں مولانا کی محبت جنس ہے شہوانیت نہیں - پھر آخر کیا مولانا ابوالکلام آزاد دور دور کی محبت کو فسق و فجور کہتے ہیں ؟ ہو سکتا ہے ایک سخت مزاج مولوی کا انداز نظر اس بارے میں یہی ہو - یہ تو خدا کے بعد ابوالکلام آزاد

ھی جائیں کیونکہ وہ بقول شبلی " عالم السرائر " ھیں۔
مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر کو میں یہیں چھوڑتا ھوں اور ان کے ۱۹۰۹ء اور بعد کے خطوط کا ذکر ندوہ کے جھگڑوں اور عطیہ کے اُسی دوران کے خطوط کے ساتھ کروں گا۔

بے موقعہ نہ ھوگا اگر میں اسجگہ یہ عرض کردوں کہ علامہ شبلی کے اشعار کا مطالعہ کرتے وقت ھم ایک الجھن سے دوچار ھوتے ھیں اشعار کی جنسی نوعیت کے علاوہ ان کے ھاں بار بار شراب اور ساغر کا ذکر آتا ھے۔ شراب محض مل بیٹھنے اور باتیں کرنے تک محدود تھی لیکن ساغرزدن کہیں کہیں دو قدم آگے چلتا نظر آتا ھے۔ شراب کے بارے میں مہدی حسن لکھتے ھیں :

" شراب منہ سے نہ لگی تھی صرف زبان پر چڑھی تھی لیکن انھوں نے چھلکتا ھوا جام دفعتاً خالی کر دیا۔

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی "

اور خود شبلی بھی تو کہتے ھیں :

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستیٔ او از شراب بود

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء

سلطان حیدر جوش کے خیال میں شبلی کی حیات معاشقہ کی ابتدا حادثہ گزندپا کے بعد شروع ہوئی - چنانچہ کہتے ہیں:

"زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بمبئی والا قلبی ہیجان مولانا کے تیمور بن جانے کے بعد رونما ہوتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے دماغی ہیجان کا مرکز سرسید کی صحبت تھی تو بمبئی کے قلبی ہیجان کی جان مس عطیہ فیضی کی ذات - اس لذت والے درد یا درد والی لذت کی اچھی خاصی جھلک ایم مہدی حسن کے چند خطوں میں نظر آتی ہے - مگر خطوط شبلی کی چھوٹی سی آرسی تو اس معاملے میں آئینہ خانہ ہے -"

ہمارے نزدیک جوش صاحب کا یہ بیان کسی غلط فہمی کی بنا پر ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شبلی کی افتاد کا اندازہ صرف خطوط سے لگایا ہے - اگر وہ اس سلسلے میں شبلی پر بھی نظر رکھتے تو شاید یوں نہ کہتے کیونکہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں لکھے گئے اشعار

جس بات کی غمازی کرتے ہیں اس کو حادثہ کزندپا (جو ۱۹۰۷ء میں ہوا) کے بعد کی بات بتانا صحیح نہیں - مثلاً اس زمانے کی دو تین غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار سنئے :

چند بی هوده به بند غم دنیا باشم
زیں سپس باقدح و باده و مینا باشم
جبه سائی حرم کعبه چو بودم یک چند
بر در بتکده هم ناصیه فرسا باشم
ای خوشاروز که رازم کند از پرده برون
دست در دامن آں شوخ خود آرا باشم
دامن عیش زدستم نرود تا شبلی
دامن بمبئی ازکف ندهم تا باشم

ستمبر ۱۹۰۶ء

غمزه ات طرح نهد رسم جفا کوشی را
جلوه یادت دهد - از خویش فراموشی را
بنگر معجزۀ حسن که آں نرگس مست
بهم آمیخته هشیاری و مدهوشی را

ساغر زندگیم حیف که جز درد نداشت
جز همیں جرعۀ آخر که به پایاں زده ام
اندکی نیز به کام دل خودبین باشم

روزگاری چو دم از دانش وعرفان زده ام۔
ساغر چند بیاد رخ رنگیں خوردم
قدحی چند در آغوش گلستان زده ام۔
از پریشانیِ ایام میندیش که من
دست در حلقهٔ آں زلف پریشان زده ام۔
ان نگار عجمی چهره بدانساں افروخت
کاتش آوردم و در خرمن ایمان زده ام۔
ان شد ای دوست که آراستمی پیکرفن
نقش زیبا صنمی بروَرق جان زده ام
ان شدای دوست که درندره به بینی بازم
که دم از صحبت آں دشمن ایمان زده ام۔
هاں وهاں دست بداریدزمن ای احباب
که به زیبا صنمی دست به پیمان زده ام
هر یک ازتشنه گران عرب و هند و عراق
یم حسن است ومن دل زده طوفان زده ام۔

کس چه داند که به خلوت گه آن ماه تمام
زده ام ساغر و برباد حریفاں زده ،
جای آں ست که گلشن دمد ازکنج لبم
بوسه هابسکه برآں عارض خنداں زده ام
صد چمن لاله وگل جو شدم از جیب وبغل
قرعهٔ فال هم آغوشی جا ناں زده ام

تا دگر آن بت خود کام زیادم نہ برد
گرہی چند در آں زلف پریشان زدہ ام
سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواھد بود
زیں نواھا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام
پی تواں برد کہ ایں زمزمہ بی چیزی نیست
شبلی این تازہ نواھا نہ چومستاں زدہ ام
ستمبر ۱۹۰۶ء

---

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مہدی حسن کو لکھتے ھیں :
اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ھوئی ھے۔ البتہ جابجا غلط چھپی ھے۔ "کافروں" کا ذکر اس میں بھی ھے۔
اس کے بعد ۱۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بانکی پور سے پھر مہدی حسن ھی کو لکھتے ھیں :
مخزن کی غزل تو ضرور نظر سے گزری ھوگی کیا اس کے پڑھ کر کوئی داخلی ثبوت ھوسکتا ھے ؟
بیگم صاحبہ جنجیرہ کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانے میں قائم ھوئے تھے۔ جو مئی ۱۸۹۲ء کا واقعہ ھے۔ اور غالبا اس وقت عطیہ ایک آدھ برس کی بچی تھی۔ یہ خاندان بمبئی کے پرانے خاندانوں میں سے تھا۔ ۱۹۰۶ء تک عطیہ بیگم کے والد مرچکے تھے البتہ والدہ زندہ تھیں۔ خود عطیہ بیگم

اس سلسلے میں رقم طراز ہیں :

" مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکان سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں سے ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہوگیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بار ایٹ لا تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانے پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں انکی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں، اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح انکا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری

ہو گیا - اس اولین ملاقات کے وقت جو یقیناً ۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ سے پہلے ہوئی ہوگی - عطیہ ہنوز پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی - خود کہتے ہیں:

غنچۂ نشگفتہ جنوں تاختن آورد بہ من
تا دگر از اثر باد بہاری چہ شود

اپریل ۱۹۰۷ء

دل بہ آن نوبر حسن ار ندهم خود چکنم
دلم از صحبت پیران ریا ساز گرفت

عشق شروع ہوا فارسی میں غزلیں کہی گئیں - دوستوں کو اطلاع دی گئی - ۲۶ ستمبر کو بمبئی سے واپس گئے تو ان چند حسین لمحوں کی یاد بھی ساتھ تھی جو کسی کے ساتھ گزارے گئے تھے - چنانچہ جب الہ آباد گئے وہاں کہے ہوئے اشعار After Effects کی بڑی اچھی مثالیں ہیں:

من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم
میل بہ لالہ رخان گر نکنم تا چہ کنم

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دهم
لیک بان نگہ حوصلہ فرسا چہ کنم

جهاں بزم می ست برهم گشتہ از آشوب خیزی ها
هنوز آں چشم پرفن برسر کارست پنداری

فریب لطف گفتار بت خود کام را نازم
سخن می گوید از انکار و اقرار است پنداری

خیال بوسۂ آن لعل نوشیں دوش می بستم
هنوزم لب زذوق آن شکربار است پنداری

من در انجام رہ عشق گرفتم در پیش
خنک آنکس کہ ہم این شیوہ ز آغاز گرفت
چہ عجب جلوہ گہ دوست شود دیدۂ من
کہ زخاک درش این آئینہ پرداز گرفت
ہر کہ یک بارنظر بررخ خوب تو کشاد
بایدش دیدہ ز دیدار جہان باز گرفت

ہر جا کہ روئی روشنۂ توجلوہ ساز بود
ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو ساز بود
جانان زبان ولب نہ شود ترجمان شوق
مارا امیدہا زنگہ ہای راز بود

پیکر آرای ازل طلعت زیبای ترا
نقش می بست وہم از ذوق تماشامی کرد
اپریل ۱۹۰۷ء

اپریل ۱۹۰۷ء میں عطیہ یورپ میں تھیں اور علامہ اقبال سے ان کا میل جول شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تخاطب My dear Miss Fyzee تک محدود تھا۔ یورپ سے عطیہ ستمبر ۱۹۰۷ء میں لوٹیں اور دوسرا سفر یورپ اپریل ۱۹۰۸ء کے آخری دنوں میں کیا اور اسی سال اُسے اپنی والدہ کی بیماری کے باعث لوٹنا پڑا۔

علامہ شبلی کی حیات معاشقہ

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اپریل ۱۹۰۷ء میں شبلی گھرلوٹے اور حادثہ گزند پا ظہور پزیر ہوا - یہ ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو رات کے دس بجے ہوا - اور اسکی پوری تفصیل مکاتیب میں صفحہ ۱۶۸ پر خود شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو- پاؤں کٹنے کا غم مولانا کو بہت تھا - خود کہتے ہیں :

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

جون اور جولائی میں مولانا چلنے پھرنے سے معزور رہے اور اعظم گڑھ میں قیام کیا- پاؤں ۹ جنوری ۱۹۰۸ء تک بھی نہ بن سکا - مولانا ۲۱ جنوری کو بمبئی آئے اور یہاں لکڑی کا پاؤں بنوایا بہت سی پر جوش غزلیں لکھیں اور پھر ۶فروری کے بعد اس چمن زار کو شداد کی طرح خیر باد کہا- اس زمانے میں عطیہ بمبئی میں موجود تھیں -

شیخ اکرام ناقل ہیں " بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لیکچر تھا - ہر دو میں شمس العلما شبلی نعمانی شریک جلسہ تھے اس کے بعد ان خواتین نے (بحوالہ عطیہ کی خاندانی ڈائری) ایک تاریخی تماشا (تابلو Tableau) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں لیکن افسوس کہ تماشے کے انعقاد سے پہلے انھیں بمبئی چھوڑنا پڑا - "

اس صاحبت نے شعر پیدا کئے تو کیسے

بے حاصلی نگر کہ باین دوری از رخش
صد جای بہر بوسہ نشان کردہ ایم ما

صرف یہی نہیں بلکہ ۲۶ فروری ۱۹۰۸ء کے خط میں حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں -

اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں - آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے -

چنانچہ اپنے ذوق نظر کی تسکین کے لئے مولانا اگلے مہینے دوبارہ بمبئی جانا چاہتے تھے - لیکن ندوہ کی زمین اور بعض اور نہایت اہم معاملات میں الجھے رہے کہ ن کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی - البتہ اب کے قیام بمبئی میں عطیہ سے کچھ ایسے تعلقات استوار کر آئے تھے کہ اس سے خط و کتابت جاری رکھی - ابتدا کے دو ایک رسمی خطوط سے انکی سیری نہ ہوئی اور دوسرے ہی خط میں اسے لکھتے ہیں -

معاف کیجئے گا میں آپ کی بجائے تم کا لفظ لکھوں گا - آپ کے لفظ میں بیگانہ پن ہے -
(۲۴ فروری ۱۹۰۸ء)

اس زمانے میں مولانا نے عطیہ بیگم سے کھلنے کی کوششیں کیں - وہ ولایت جانے کی تیاری میں مشغول تھی - اور آپ بار بار اس سے روانگی کے متعلق پوچھتے تھے - پھر کبھی کہتے " چاہتا ہوں کہ بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے کہیں اور چلا جاؤں " یا پھر یہ کہ "میر

ارادہ قطعی تھا کہ روانگی کے وقت، بمبئی میں موجود ہوں گا اور تمہیں خدا حافظ کہہ سکوں گا لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایک عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا میں تحمل نہیں کر سکتا۔"

خدا حافظ والی نظم میں تو مولانا نے کمال ہی کر دیا ہے یعنی وہی نظم جو انہوں نے چند سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کی روانگی یورپ کے موقع پر لکھی تھی تھوڑے تصرف کے ساتھ اسے بھیج دیتے ہیں۔ یعنی ایک عزیز * چیز کو عزیز تر چیز کے لئے قربان کر دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی جب وہ کچھ نہیں سمجھتی تو اگلے خط میں لکھتے ہیں:

می روی وگریہ می آید مرا

ساعتی بنشین کہ باران بگذرد

(اپریل ۱۹۰۸ء)

اس زمانے میں مولانا کی شاعری کا رنگ بھی دیدنی تھا۔ ایک غزل دیکھئے:

امنی ثمانہ خلوتیان حجاز را

دیدی تطاول خم زلف دراز را

ذوقی دگر بود بہ تماشہ گہ وصال

چشمی بخواب در شدہ نیم باز را

---

* عزیز اس لئے کہ مرنے کے بعد مہدی حسن بھی باپ کی طرح مولانا شبلی کو عزیز ہو گیا تھا۔

هر گاه یکی و خوبی و رعنائی تو نیست
ما دیده ایم کج کلهان طراز را
بے چاره نکته دان ادا های عشق نیست
ضائع مکن به غیر نگه هائی راز را
ما از بلند و پست جهان در گزشته ایم
از بسکه دیده ایم نشیب و فراز را
هر چند جور نیز ز معشوق خوش بود
ما بنده ایم دلبر عاشق نواز را
چیزی ز لطف نیز بیامیخت درستم
تا اعتدال دادمی تند ناز را
آدر برم که کار ز اندازه در گزشت
دست دراز گشته آغوش باز را
من خود نخواهم اینکه بر افتد حجاب راز
اما چه چاره کلک حقیقت طراز را

اسی زمانے میں (مارچ ۱۹۰۸ء میں) عطیہ بیمار ہو جاتی ہے - مولانا سمجھتے ہیں کہ ناراض ہے اس لئے خطوں کا جواب نہیں دیتی - چنانچہ زہرا کو لکھتے ہیں:

میرے خط کا جواب عزیز موصوف نے نہیں لکھا - شاید کسی بات سے ناراض ہو گئی ہو یا جلد جلد خط و کتابت کرنا خلاف شان سمجھا ہو - بہر حال میں بھی پیش دستی نہیں کرتا -

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں " ہاں آپ نے

پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا تھا - عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں حسن صاحب مرحوم عمر اور ہر حیثیت میں میرے چچا تھے - اس لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہئے - میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے - اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں"

اس کے بعد جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے - عطیہ بیگم یورپ کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہیں - لیکن زہرا اور ان کی والدہ بمبئی ہی میں رہتی ہیں - یہ واقعہ اپریل ۱۹۰۸ء کے آخر کا ہے* - اسی دوران میں دستۂ گل طبع ہوگیا - ۲ مئی کو زہرا کو لکھتے ہیں "میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور - ان کانٹوں کا نام دستۂ گل رکھ دیا ہے - جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد شعر قلم سے نکل گئے ہیں اس لئے ان کا پردے میں ہی رہنا مناسب ہے" - پھر ۲۲ مئی کو لکھتے ہیں "دیوان تو نہ بھیجوں گا - لیکن وقتاً فوقتاً معتدل غزلیں نکال کر بھیجتا رہوں گا - ندوے کا جھگڑا نہ ہوتا تو میں بمبئی کو گھر بنا لیتا مسز لقمانی صاحب نے بھی دستۂ گل مانگا تھا - میں نے ان سے بھی انکار کر

---

* سیر یورپ ص ۳ (شائع کردہ مرغوب ایجنسی لاہور) سیر یورپ ۲۵ اپریل ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ختم ہوا (ایضاً ص ۳۰۷)

دیا ہے - کالائے بدبہ ریش خاوند" - اس دوران میں مولانا کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے - چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک رومال چکن کا جس پر عطیہ کا نام کاڑھا گیا ہو - یورپ بھیجیں - جو بقول ان کے حسب مرضی نہ بنا اس لئے نہ بھیجا گیا -

عطیہ یورپ سے واپس آئی جس کی مبارک باد مولانا نے ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اس طرح پیش کی :

"ایک بے ریا دل - ایک مخلص دل وفاشعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد قبول ہو - "

صرف یہی نہیں بلکہ اُسے لکھا :

تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک اور حقیر ہدیہ ہے - کیا ان دونوں چیزوں کو قبول کرسکتی ہو !"

اور وہ حقیر ہدیہ کیا تھا - اس کی تفصیل بھی خود مولانا کی زبانی سنئے :

" اپنی تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے ... اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے - بھیجتا ہوں وہ میری قائمقامی کرے گی - "

افسوس دوسری طرف سے بقول مولوی عبدالحق صاحب کوئی اشتیاق نہ ظاہر کیا گیا -

نومبر کے مہینے میں عطیہ کا لکھنؤ آنے کا ارادہ ہوا -

مولانا نے مولوی مشیر حسین قدوائی سے سن پایا کہ وہ ان کی مہمان ہوں گی چنانچہ مولانا ۲ نومبر ۱۹۰۸ء کے خط میں یوں خفا ہوتے ہیں اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوں گی تو اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا"

لیکن معلوم ہوتا ہے یورپ سے واپسی کے بعد عطیہ شبلی سے کچھ دور دور سی ہو گئی تھیں - اس لئے لب و لہجہ کا مولانا نے ایک جگہ یوں گلہ کیا ہے :

"یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے - اس لئے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا اب صحیح نہیں - خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خود دارانہ ہے"

اسی زمانے کے علامہ اقبال کے عطیہ کے نام خطوط میں قدم قدم پر خلوص - ہمدردی اور رنگینی بڑھتی نظر آتی ہے -

شبلی عطیہ کے مشیر حسین صاحب کے ہاں قیام کا گلہ اپنی اس زمانے کی غزلوں میں بھی کرتے ہیں :

شاهداں در باغ در هجر تو زار افتادہ‌اند
این قیاس از نرگس بیمارمی بائست کرد
شرط همت نیست تنها بادہ و ساغر زدن
محتسب رانیز با خود یارمی بائست کرد

شیوه هائی دلبری را خوب می داند ولی
آنچه با ما کرد با اغیار می بائست کرد
با بداں هم چشم لطفی ای چمن پیرای صلاح
آنچه باگل کرده باخار می بائست کرد
بوسه تنها بشکند خمیازهٔ ذوق مرا
تلخئ دشنام هم درکار می بائست کرد
۲۵ اکتوبر ۱۹۰۸ء

ان قدر محو تماشای جمالش بودم
که نگه را خبر از لذت آزار نماند
کار آں نرگس مستانه بود این که بمن
نگهی کرد که با هیچ کسم کار نماند
یا جگر کاوئ آں نشتر مژگاں کم شد
یا که خود زخم مرا لذت آزار نماند
فتنهٔ حسن تو از بسکه جهاں برهم زد
درمیاں تفرقهٔ مسجد و زنار نماند
۲۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء

بسکه رنجوری این خسته زتیمار گذشت
عیسی آخر زعلاج دل بیمار گذشت
بی سبب نیست که یوسف ز بها افتاد است
دلبر شوخ من از خانه به بازار گذشت

علامہ شبلی کی حیات معاشقہ

آہ جاں سوز کہ در سینہ ام آرام گرفت
این ہماں است کہ از گنبد دوار گزشت
داد ازیں پیری بی صرفہ کہ ناخواندہ گزشت
آہ ازان عہد جوانی کہ بہ ناچار گزشت
۲۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء

یک سر و صد گونہ سودائی نہانی داشتم
یاد آن روزی کہ من با خود جہانی داشتم
یاد آن روزی کہ پنہاں از حریف بد گماں
آشتی ہای نہاں باپاسبانی داشتم
یاد آن روزی کہ دست افشاں گذشتم از حرم
از غرور آنکہ من ہم آستانی داشتم
شبلیا آن جلوۂ نیرنگہای بمبئی
بود تا وقتی کہ من خوابی گرانی داشتم
(یکم نومبر ۱۹۰۸ء)

از بسکہ طفل بودہ و کار آشنا نبود
جوری کہ کردہ است بطور جفا نبود
دل رابایں فریب تسلی دہم کہ یار
باما ازاں نساخت کہ زود آشنا نبود
آن بزم ناز بسکہ زبیگانہ پر شد است
دیدم کہ جای یک نگہ آشنا نبود
محروم ماندہ ایم ہنوز از شمیم زلف

وین شکوہ از تو بودز بساد صبا نبود
(یکم نومبر ۱۹۰۸ء)

می نرنجم اگر وفا نہ کند یار ز ود آشنا چنیں باشد

---

۳ نومبر ۱۹۰۸ء

حرف انکار زخوباں ہمہ از دل نبود
گہ گہ ایں کا ربہ آئین حیا نیز کنند
(۵ نومبر ۱۹۰۸ء)

عطیہ کچھ کچھ الگ ہی رہی - اگرچہ بمبئی کا مہمان جب آیا اور انہیں کے ہاں ٹھہرا تو مہدی حسن کو ۲۶ نومبر ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں-

"آج کل بمبئی کا مہمان حسن اتفاق سے یہیں ہے یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اُس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہ ہوا ہوگا - لیکن بد قسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر بد تر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا - نہ وقت نہ - دماغ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا-ان صحبتوں میں اسکی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گذر رہے تھے —— آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری —— افسوس غیرت اور محبت کی کش مکش تھی ورنہ تم دیکھتے جو میں کہتا ہوں -"

اور مولانا کیا کہتے تھے؟ وہ تو باربار یہی کہتے تھے کہ:

خنک آں کس کہ بہ ذوق نظری قانع شد
وای بر من کہ صد اندیشۂ باطل دارم

مہدی حسن کو اگلے خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں:

"صاحبی ندوے کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام کم کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا - اب تک تو وہ خمار نہیں اترا - سو طرح چاہتا ہوں کہ اس (ندوہ) دام سے دو دن کے لئے چھوٹ سکوں لیکن اور زیادہ الجھ جاتا ہوں ...... ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے بالکل عام دنیا سے مختلف ہے یہاں بھی یکتائی کی شان ہے"

مگر اس کے باوجود جب محبوب ان کے پاس آیا تو ان کی شاعری میں وہ گرمی پیدا نہ کرسکا اس لئے کہ حرف انکار درمیان میں تھا - اس زمانے کی غزلوں کے بارے میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

بوئے گل کی نسبت اہل نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے - واقعی دونوں کی شان نزول اس قدر مختلف ہے ایک شعر میں خود یہ راز کھل گیا ہے:

یا جگر کاوی آن نشتر مژگاں کم شد

پا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند"

تاہم مولانا کا عشق اپنے عروج پر تھا - ۱۹۰۹ء کا سارا سال انکی زندگی کا کامیاب دور ہے - چنانچہ ۲۴ مئی ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں -

عطیہ خدا ایسا موقعہ لائے کہ چند روز جنجیرہ میں رہ سکوں یا بمبئی میں ماؤنٹ روڈ پر لیکن کیا اس کی توقع ہے ؟

اس زمانے میں مولانا کا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا - کبھی عطیہ کو نور جہاں بناکر اشعار میں اس کے ذکر کی وجہ تلاش کرتے کبھی اپنے اشعار کی تشریح کرکے موقع و محل پیدا کرتے- کبھی اُسے موسیقی کی تلقین کرتے اور اس کے انداز تحریر کی داد دیتے :

ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں - وانا اول العابدین

حالانکہ مقصود صرف انا اول العابدین ہی تھا - یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ عطیہ بیگم جیسا کہ خود شبلی کے بیانات اور عطیہ کی اپنی تحریرات (دیباچہ خطوط اقبال) سے ظاہر ہوتا ہے ' بڑی ذہین عورت ہے - لیکن اس کے ساتھ علامہ شبلی کو جو بات سب سے زیادہ دلکش نظر آئی وہ اسکی مردانہ صفات ہیں - چنانچہ اسی خط میں آگے جاکر لکھتے ہیں-

عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں اُن کی دست نگر تھیں - تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے - جمال اور حسن - نزاکت پر موقوف نہیں - تنومندی دلیری - دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن وجمال قائم رہ سکتا ہے - مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے -

اس کے بعد پھر اسی موضوع پر اگلے خط میں لکھتے ہیں :

عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی - لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی - یہ تو علم ہے کہ صحت کیلئے 'تندرستی کے لئے' جسم کی موزونی کے لئے' جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے - پر میری رائے نہیں بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے -"

اس طرح شبلی "سلطان جمال" کو اشارے کنائے سے سمجھاتے رہے اور اس میں ان مردانہ صفات کا سراغ لگاتے رہے ایک دفعہ تو کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کر گئے عطیہ کی مردانگی ان کی نرگسیت کے باعث ماعبت پر مجبور ہوتی رہی - مولانا نے بقول "حالی" گرماگرم اشعار کی تشریح عطیہ کو ایک خط میں لکھی اور یوں رقمطراز ہیں: مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں - لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو - مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم نے میری تشریح اشعار کو اور خود اشعار کو پسند کیا - ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہے -"

اس آخری فقرے میں نہ جانے کتنی آرزوئیں دبی ہوئی ہیں -

اس زمانے میں عطیہ کے نام اقبال کا پہلا خط Dear Miss Atyya کے القاب سے آتا ہے - جس کی تاریخ ۱۳ جنوری ۱۹۰۹ء ہے - پھر ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو My Dear Miss Atyya ہو جاتی ہے - اور علامہ اقبال اپنے گھریلو واقعات اور اپنی بیوی کے بارے میں اسی سے ذکر کرتے ہیں - اس کے بعد پر خلوص خطوط کا یہ سلسلہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء پر جاکر ختم ہو جاتا ہے -

اقبال اپنی شادی کے مخالف تھے اس دوران میں وہ ملک چھوڑ جانا چاہتے ہیں - عطیہ کو اپنا غم گسار جانتے ہوئے دل کھول کے رکھ دیتے ہیں - اور یہ ان کی دریادلی کا ثبوت تھا -

اس موقع پر ان خطوط میں ایک فقرہ آتا ہے - You should be more careful معلوم نہیں اس کا یہاں کیا موقع تھا ؟ کیونکہ اوپر کے پیرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ ہے -

بہر حال شاید عطیہ مولانا شبلی پر دلنوازی کا حق کچھ زیادہ ہی جتانا چاہتی ہے - وہ فرمائش کرتی ہے لیکن ایسی نہیں کہ مولانا کے بس کا روگ نہ ہو - وہ خود کو شہرت دوام دینے کے لئے اپنے نام ایک تصنیف کو معنون کرانے کی خواہش کرتی ہے - مولانا کے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں چٹکیاں لیتی ہیں مگر میں اور اندیشہ ہائے ، دور دراز کے مصداق وہ اس بات کو کسی موزوں تر وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں :

" عطیہ تم سے زیادہ مجھے خوشی ہو گی - اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام کر معنون کرسکوں - یہ وقت ضرور آئے گا - لیکن کب آئے گا ؟ اس کا فیصلہ آج نہیں کر سکتا "

لیکن بات کل پر ٹال دینے سے وہ اپنے دل کی آواز دبا نہیں سکے پھر کہتے ہیں :

عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں سے بھیجوں۔ لکھنئو میں کوئی چیز تمہارے قابل نہیں۔

۱۹ اگست ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں "شعرا اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا متانت۔ بلاغت اور لطافت خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ جہانگر بادشاہ کی مدح میں قیصیدے لکھتے تھے۔ عموماً نورجہاں بیگم کا نام لاتے تھے اس اصول پر میرا شعر ہے:

نازم کہ ایں عطیہء فیض امیرہ ایست
کاوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

اور یوں تو صراحتاً تمہارے لئے وداعیہ غزل خیر مقدم وغیرہ لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

یہ کتنے کھلے ہوئے اشارے تھے چنانچہ عطیہ نے لکھا جنجیرہ آؤ اور جب چاہو واپس جاؤ۔

لیکن بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مولانا نہ جاسکے۔ عطیہ نے ان کے اس فعل پر طعنہ دیا جس کے جواب میں مولانا آسے لکھتے ہیں:

تم کہتی ہو میں بد ہمت ہوں میری زندگی کے دو حصے ہیں پرائیویٹ اور پبلک اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ

کر سکتیں"

(۱۹ اگست ۱۹۰۹ء)

لیکن یہ بات انہیں کھٹکتی رہی چنانچہ ۲۸ اگست ۱۹۰۹ء کو انہیں آخر یہ کہتے ہی بنی :

زود می آیم و این ہم دیر است

وا حسرتاکہ اب کے پھر نہ جا سکے - مگر تابہ کے - آخر ندوہ کے کاموں سے وقتی رہائی پائی - چنانچہ ماہ اکتوبر کو بمبئی سے جنجیرہ پہونچے - ان وقتی مصروفیات میں ایک مصروفیت یہ تھی کہ اُن کی لڑکی فاطمہ سخت بیمار تھی اور بغرض علاج لکھنؤ میں آئی ہوئی تھی - اور مولانا اُسے واپس گھر بھیجنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے - بیٹی کو شک ہوگیا اور اس نے خط لکھا جس کے جواب میں مولانا کہتے ہیں :

فاطمہ ! نہ میرا پہلے خیال تھا نہ اب ہے کہ تم کو جلد رخصت کروں - تمہارا علاج سب سے مقدم ہے - تم نے خود ہی لکھا تھا کہ مجھ کو دو چار دن میں جانے دیجئے - اس پر میں نے لکھ دیا تھا -

میری طبیعت اب تک اچھی نہیں ورنہ تم سے خود آکر یہ باتیں کہتا

(یہ رقعہ دفتر سے مکان پر بھیجا گیا)

۲۹ جولائی ۱۹۰۹ء

مئی کو دوسرا خط انہوں نے جنجیرے سے لکھا تھا جس میں ذکر کیا تھا کہ چند روز ابھی سفر میں گزریں گے -

اب مولانا کا عشق کامیابی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا - اس کی یادگار یہ قطعہ ہے :

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہو گی
خیال روزہ و فکر وضو ہو گی تو کیوں ہو گی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلی میں
اُسے خلد بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

اس قیام کی تفصیل عطیہ بیگم اپنی خاندانی ڈائری میں (بحوالہ اکرام) یوں دیتی ہیں :

" آخر مولانا شبلی صاحب اور مشیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے - مدتوں سے وعدہ تھا - مگر بارے شکر کہ اجرا ہوا - اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے - مولوی صاحب

نے یہاں پہنچتے ہی چند اشعار اس جگہ کے
متعلق کہے .... کسی کو یاں الخ "
اس کے دو دن بعد ۱۷ اکتوبر کو مولانا بمبئی پہنچے
اور ذیل کا قطعہ لکھا :

یاد صحبت ہائے رنگین جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوق سخن تھا صحبت احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرت خلد بریں ہر گوشہ ویرانہ تھا
غنچہ و گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالہ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

اس دوران میں مولانا کی عدم موجودگی میں فاطمہ فوت ہو گئی اب عطیہ کی طرف سے رد عمل شروع ہو چکا تھا ۔ چنانچہ عطیہ نے خط کے ذریعے کنایہ والے شعر پر ناراضگی کا اظہار کیا اس پر مولانا لکھتے ہیں :

"اچھا ہوا کہ میں نے ان سطروں کے معنی تم سے دریافت کئے ورنہ ممکن تھا کہ میں تمہارا

نام اسی طرح کسی موقع پر لاتا اور تم کو رنج ہوتا۔
لیکن مجھ کو حیرت ہے کہ تم یہ کیونکر سمجھتی
ہو کہ وہ تمھارا نام ہے عطیہ کے معنے داد و دھش اور
انعام کے ہیں اور اسی معنی میں استعمال کرتا
ہوں - یہ دوسری بات ہے کہ اتفاق سے یہی تمھارا
نام بھی ہے - غیر آدمی کیونکر جان سکتا ہے کہ
میں نے تمھارا نام لیا - اس لئے تم کو رنج کرنے کی
کیا وجہ — بہر حال آئندہ نہ لکھونگا''۔

اس کے بعد اگلے دنوں میں جابجا مولانا جزیرے کی
صحبت کا ذکر کرتے ہیں مثلاً اس خط میں آگے چل کر
عطیہ کو لکھتے ہیں

''جزیرے کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے''
(۱۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

اس کے بعد مولانا ندوہ کے کاموں میں مصروف ہوئے
بنیادی پتھر نازلی بیگم (عطیہ کی بہن) سے رکھوانا
چاہا - ملاؤں نے مخالفت کی چپ ہو رہے - علی گڑھ
کا سوال اٹھایا - مولانا نے جلسوں میں بہت کچھ کہا -
عطیہ کو یہ بھی برا معلوم ہوا - اس نے غضب آلود خط
لکھا - جنوری ۱۹۱۰ء کو مولانا لکھتے ہیں :

''امید ہے کہ آپ خط کے بعد غیظ و غضب کو
دور فرمائیے گا - اور قدیم مراسم قائم رہیں گے'' -

یاد رہے کہ اس خط میں القاب بجائے عزیزی یا

قرۃ العینی کے خاتون محترم لکھا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے کئی خط لکھے۔ عطیہ نے جواب نہ دیا۔ آخر اکتوبر میں اس نے ایک خط لکھا۔ مولانا جواب میں لکھتے ہیں

"مدت کے بعد تم نے یاد کیا دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہو گئے"۔

جب مولانا کو یہ چشمہ سراب بنتا نظر آیا تو انہوں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ نگاہ بار بار ابوالکلام آزاد اور مہدی حسن کی طرف اُٹھتی تھی۔

دسمبر ۱۹۰۹ء کو ابوالکلام سے شبلی کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب بقول خود ابوالکلام آزاد کے اُن کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی۔ مولانا انہیں ایک مختصر خط میں لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا تھا کہ آپ نے میری نیاز مندی کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن جبہ طلبی کے آرام سے ثابت ہوا ع خود غلط بود الخ یہ بھی بار بار لکھنے کی بات تھی؟"

انہیں دنوں مولانا شبلی کا ندوہ میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اور اُن پر علما کی طرف سے جو الزامات عاید کئے گئے تھے ان میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی تھی۔

"ہاں انہیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے!"

مولانا ندوہ میں اس بار تو رہ گئے لیکن "آزاد کے ساتھ تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا اور انہیں کئی معذرت آمیز خط لکھنے پڑے۔" مہدی حسن سے انہوں نے لاکھ کہا کہ وہ انہیں اپنے گھر بلائیں اور اپنی نئی بیوی سے متعارف کرائیں لیکن وہ کاچھ بدک گئے تھے اس لئے کہ عطیہ والے معاملے میں راز دار وہی تھے۔ مہدی حسن صاحب اسے "نفوس قدسیہ نے ساٹھ سال کی عمر میں" بیوی کو پردہ کرانے پر مصر رہے۔ عطیہ بھی بیزار رہیں۔

اس سال کے آخر میں (۱۹۱۰ء) رسمی مراسم کا سلسلہ اگرچہ استوار ہو گیا اور ابوالکلام سے جس رسمی تعلق ہی پر اکتفا کا ارادہ ظاہر کیا تھا عطیہ کے بارے میں سچ ثابت ہوا دسمبر ۱۹۱۰ء کو الہ آباد میں نمائش تھی۔ عطیہ وہاں تھیں مولانا شبلی بھی پہونچ گئے۔ ملاقاتیں ہوتی رہی عطیہ اس کا تذکرہ طنزیہ انداز میں اپنی خاندانی ڈائری میں یوں کرتی ہیں:

> "ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقات کے لئے آتے تھے۔ اور لا ناغہ ایک خوان عمدہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بیچارے بڈھے میاں گو کہ پرانی وضع کے ہیں۔ مگر خیالوں میں وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرہ سی

یہ بات ہوتی"۔

بڈھے میاں کی اس پھبتی میں عمر کا جو فرق قائم کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کے کسی خط میں نہیں ۔ مولانا شبلی کو اس انداز نظر کا تھوڑا بہت احساس تھا ۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

نہیں معلوم کہاں جاؤں جزیرے کی کشش
میں ذرا شبہ ہو گیا ۔

دراصل مولانا نے احتیاط سے کام لے کر شبہ کا لفظ استعمال کیا تھا ورنہ معاملہ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا ۔ چنانچہ ان واقعات کے بعد ایک مرتبہ عطیہ جب بمبئی آئی تو اتفاق سے مولانا بھی وہیں تھے ۔ لیکن بدلتے حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ ان سے ملے بغیر واپس چلی گئی مولانا سے نہ رہا گیا ۔ ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو ایک خط لکھا اور اس میں گلہ کیا ۔ صرف گلہ کیونکہ اب آہوئے رمیدہ کو کون پکڑ سکتا تھا اور پھر پا بریدہ کہاں تک تعاقب کرتا ۔ تھک ہار کر رہ گئے ۔ ابوالکلام سے بھی بگاڑ ختم نہ ہو سکا ۔ ۱۸ اگست ۱۹۱۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"آپ کا لہجہ اگرچہ اب تک نہیں بدلا ۔
لیکن بخدا یہ امید قائم ہے کہ کلکتہ پہونچوں گا
تو آپ سخت دلی سے کام نہ لے سکیں گے اور
ظاہری طور سے سہی لیکن قدیم عنائتیں پھر

مندمل ہو گی - اور میرے لئے اسی قدر کافی ہے۔
پھر وہ مجاز رفتہ رفتہ حقیقت بن جائے گا - ان
باتوں کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت
سے منفعل ہو جاتا ہوں - کہ جرم سخت ہے بلکہ
سخت تر - لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل
بھی اسی قدر نرم بلکہ نرم تر ہے"۔

مہدی حسن بھی بیگم صاحبہ کو بیاہ گئے - ابوالکلام
بھی گئے اور عطیہ بھی گئیں -

نی ذوق نگاہی و نہ ہنگامہ عشقی
ای وای بہ شہری کہ دروفتنہ گری نسیت

یہ مولانا کا اسی زمانے کا شعر ہے -

عطیہ والے معاملے نے بہت جلد انتہائی شکل اختیار
کر لی - ۷ جولائی ۱۹۱۱ کو علامہ اقبال کے خطوں کا القاب
بھی مائی ڈئر عطیہ کی جگہ مائی ڈئر مس فیضی ہو گیا
اور ایک منحوس صبح کو مولانا کو معلوم ہوا کہ عطیہ کسی
اور کی ہوگئی ہے - اس نے ایک یہودی سے شادی کر لی - کون
جانتا ہے اس وحشت ناک خبر سے ان پر کیا گزری ہوگی -
کاچھ وقت گزرنے کے بعد مہدی حسن کو لکھتے ہیں :

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا
دئے گئے - لیکن کیا ۵ دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی
جس دن کہ ...... ایک یہودی کے ہاتھ آئی -
مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا - اس لئے

تو نہیں ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

خیر ع سبحہ راز نار کر دست و کند

(۱۳ دسمبر ۱۹۱۲ء)"

اور پھر عطیہ کو لکھا:

بتان ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو

عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلمان ہے

وہ خوش نصیب یہودی ایک مشہور آرٹسٹ رحمین تھا۔

اس کے بعد مولانا فیضی خاندان سے ملتے تو رہے لیکن جذبات کا وہ طوفان جو چند سال قبل کی فارسی غزلیات میں موجزن تھا اب تھم چکا تھا۔ مولانا شعر اب بھی کہتے تھے لیکن:

شب وصل است حیا گر بگذاری چہ شود

یک دمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

بوسہ ھا بر لب نوشین تو وام است مرا

وام من ہم بہ من ار باز سپاری چہ شود

ایسے اشعار کی جگہ اب ان کی زبان پر کچھ اس قسم کے اشعار ہوتے تھے:

بس کہ غارت گر حسن تو جہان برہم زد

یوسف از خانہ دروں جست و ببازار افتاد

شیوۂ مہر ز خوباں نتوان داشت طمع

افتاد بسیار طائفہ بایں کار مرا کہ

یہاں عطیہ ایک عورت نہیں رہتی بلکہ تمام دنیا کی
عورتوں کے لئے ایک جنسی علامت بن جاتی ہے جس کی
شادی بازار میں بک جانے کے مترادف ہے - از خانہ بروں
جست گھر سے نکل کر بازار میں آ جانا - اس طرف
مولانا کا ہندوستانی ذہن کیوں گیا ہے؟ غور فرمائیے -

اس شکست کے ساتھ ندوہ کے میدان میں بھی آخر
عمر میں مولانا کو شکست ہو گئی اور شیخ الکل بننے کے
جو خواب وہ دیکھا کرتے تھے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے -

"نتیجہ یہ ہوا کہ گو انہوں نے ندوہ کو بے حد
فائدہ پہونچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر
میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے
مار کھا گئے - جس کا ان کے دوستوں کو بے حد
ملال ہوا - اور خود وہ بھی اپنی محنت کے اکارت
جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے"

ندوے کی بساط پر انہوں نے سماجی، معاشی،
اقتصادی، سیاسی ہر طرح کے مہرے پھیلائے - لیکن ہر
جگہ ناکامی ہوئی اس زمانے کی سیاسی شاعری طنز کے
نشتر ہیں جو لازماً اپنی تمام تر ناکامیوں کا نتیجہ تھے -
اردو میں ان کے اشعار کا یہی پہلو انہیں اپنے معاصر
شاعروں سے الگ کرتا ہے - ان اشعار کی برش اور تیزی سے
بڑے بڑے سورما کترانے لگے کیونکہ امرت زہر میں تبدیل

وچکا تھا اور زیر شاخ گل بلبل نہیں بلکہ افعی سوتے تھے ۔

ایسی عظیم شخصیت کا نوحہ ایسی طنزیہ شاعری ہی ہو سکتی تھی ۔

شبلی نا کام جئے اور ناکام مرے یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ۔

اعتراضات اور ان کے جواب

اس مضمون کی پہلی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا - خود محترمہ عطیہ بیگم کو ایک مضمون بعنوان " شبلی اور خاندان فیضی " لکھنا پڑا - بعد ازاں کوئی نوے صفحات کا مضمون میرے خلاف خالد حسن صاحب قادری نے نگار میں شائع کرایا - اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نیاز فتحپوری نے سید سلیمان ندوی کی خوب خبر لی - اور اُن گہرے زخموں کا حساب چکایا جو اکثر موقعوں پر مذہب کے معاملے میں سید صاحب نے نیاز صاحب پر لگائے تھے - نیاز صاحب نے ایک اور فائدہ بھی اُٹھایا - شبلی کی زندگی کے اس پہلو پر طویل بحث کی اور ایک ٹریبیونل بھی بٹھایا جس کا فیصلہ بھی نگار میں چھپا - یار ایام کے سلسلے میں علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر سید سلیمان ندوی کا خط بھی نگار میں چھپایا گیا اور امین زبیری صاحب کی طرف سے بھی اس پر کچھ اضافے کئے گئے امین صاحب کا مضمون بعد ازاں ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں چھپا جن پر بعض لوگوں نے تبصرے کئے - ان میں سے قاضی عبدالغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط - عبدالماجد

دریا آبادی - مولوی احمد مکی صاحب کے تبصرے قابل ذکر ہیں شیخ اکرام نے بھی شبلی نامے میں امر پر لکھا - اس سلسلے میں جو اعتراضات ہوئے ان کا جواب یہاں فرداً فرداً دیا جاتا ہے -

خالد حسن صاحب قادری لکھتے ہیں :-
ہم فاضل مقالہ نگار وحید قریشی کے اس جذبے کو مستحسن نگاہ سے نہیں دیکھتے جو شبلی کو دوسرا سرسید بننے کی ایک بے چین خواہش اور عطیہ بیگم کے ساتھ ایک رنگین معاشقہ کا اتہام عائد کرنے میں کار فرما ہے -
یہ لکھنے کے بعد فاضل معترض نے اتنا بھی نہیں کیا کہ سرسید بننے کی خواہش کے خلاف ایک آدھ دلیل یا کم از کم ایک آدھ ثبوت مہیا کر دیتے - میں نے اس کی بنیاد شرر کے دیباچہ نظم شبلی اور مہدی حسن کے شبلی کی معاصرانہ چشمکیں* پر رکھی تھی -
مہدی حسن کا اصل فقرہ یہ تھا -
یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ لیا -

---

* یاد ایام کا اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے -

معلوم ہوتا ہے یہ فقرہ خالد حسن صاحب کے پیش نظر بھی تھا - اسی لئے تو وہ سرسید کے گروپ سے شبلی کے تعلقات سے بانچ بچا کر نکلتے ہوئے مولانا شبلی اور خودی کے موضوع پر لکھتے چلے گئے ہیں اس مضمون میں آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ فاضل مقالہ نگار کا خودی سے مقصد وہی احساس خود داری ہے جس کا ذکر مہدی حسن نے کیا ہے یا اس سے مراد اقبال کا فلسفۂ خودی ہے (یاد رہے موخرالذکر میں موسیقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں) - اور شبلی بقول خالد اس لحاظ سے بے عیب ہیں کہ ان کے کردار میں کوئی خامی ہو سکتی ہے - خیر تضاد کو چھوڑئے - آگے چل کر خالد حسن لکھتے :

> بات اصل ہی یہ ہے کہ محبت مجازی بھی انساں کی طبعیت کو درد مند بنا دیتی ہے اور اس کی طبیعت میں ایک قسم کا سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے ...... قلب میں ایک تجاذبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے...... غرض عشق مجازی سے دل میں لطف اور سچے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور قلب کے اندر صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں کہ اس کے اندر صفات آلھیہ کی تجلیات منعکس ہو سکیں...... (تجاذبی کیفیت کے ساتھ) انفعالیت - سپردگی - سوز و گدار - رقت قلب بھی پیدا ہونی ضروری ہے اور یہ محبت کے

بغیر ممکن نہیں - خواہ انسان کی محبت ہو یا
خدا کی -

اقبال کے فلسفۂ خودی اور عام تصوف کی شاہراہ میں جو بنیادی فرق ہے وہ قارئین پر چھوڑتا ہوں - البتہ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ شبلی صوفی تھے یا نہیں - میرے خیال میں علامہ کی تحریر و تقریر کہیں سے بھی ان کے صوفی ہونے کی شہادت بہم نہیں پہنچائی جا سکتی - البتہ ان مذہبی تحریکات کے زیر اثر اور احیاء مذہب کے طور پر شبلی بھی اپنے معاصرین کی طرح سائنس اور مذہب میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے - اس لئے ان کی نگاہ انتخاب معتزلہ پر پڑی اور اس طرح وہ اُس نئی معتزلی تحریک کے بانی ہوئے جو انہیں کے ساتھ ختم ہوگئی - انہیں صوفی سمجھنا یقیناً اُن کی توہین ہے -

خودی ' عشق مجازی ' آئیڈیل عورت ' اس طرح کے تصور پیش کرنا جن میں آپس میں تضاد ہو یقینا علامہ کے بارے میں کسی قطعی رائے پر نہ پہنچ سکنے کا نتیجہ ہے - معلوم ہوتا ہے متذکرہ بالا اصطلاحات کا مفہوم بھی معترض کے ذہن میں معین نہیں - انہیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ شبلی اقبال کے مرد مومن تھے - یا نیٹشے کے فوق البشر یا نسفی کے انسان کامل -

خالد حسن صاحب شبلی کو صوفی ماننے کے بعد ان کے موسیقی سے شغف کو آسانی سے جائز قرار دے سکتے تھے - حیرت ہے انہوں نے اس موقع پر ان پہ دو عملی کا الزام کیوں لگایا اور ان کا یہ کہنا کہ شبلی عطیہ والے خطوط میں لئے دیئے سے رہتے ہی اور بھی حیرت انگیز ہے کوئی کھلی ہوئی بات سے انکار کر دئے تو میں اسی شخص کو تو صوفی مان سکتا ہوں لیکن اس کے پیرو کے بارے میں جب بھی مجھے اختلاف رہے گا -

وہ شبلی کو صوفی کے علاوہ ریفارمر بھی مانتے ہیں - یہاں وہ دبے لفظوں میں شبلی کو پیغمبر بنانا چاہتے ہیں کیونکہ " صوفی وہ ہے جو ذھنی ارتقا کی منزلیں طے کرکے واپس نہیں آتا اور پیغمبر وہ ہے جو روحانی بلندیاں حاصل کرکے واپس آتا ہے اور خدمت خلق پہ کمر بستہ ہوتا ہے "

میرے خیال میں فلابیر کی طرح ان کی محبت مادی تھی- اور مادام X کے مقابلے میں انہوں نے عطیہ اور ابوالکلام آزاد کا آئڈیل تراشا تھا جو خود انھی کی ذات کا ایک پر تو ہے - لیکن میرے نزدیک ان کی اس افتاد کو خامی تصور کرنا صحیح نہیں - خامی تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے - مولانا کی شخصیت میں کہیں تضاد نہیں ان کا ہر فعل - ان کی ہر بات ایک ھی مرکزی نقطے سے متعلق ہے - اگر آپ ان کی زندگی کے مختلف واقعات

کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے۔

خالد حسن صاحب کے بگڑنے کی وجہ تو صرف اتنی سی ھے کہ وہ شبلی میں ایک ایسی بات نہیں دیکھنا چاھتے تھے جو ان کے اپنے اخلاق کے تصور کے خلاف ھو اس لئے جب جنس کا لفظ استعمال کیا گیا تو خالد صاف بگڑ گئے۔ انہوں نے میرے مضمون کا یہ فقرہ نقل کیا تھا:

یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ھوگا اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب میں تھا تو اس کے ساتھ ھی جنسی پہلو ابتدا ھی سے نمایاں تھا ......

پورا پیراگراف یوں ھے!

یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ھوگا کہ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ھی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ھی سے نمایاں تھا ھم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ھوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ھیں کہ اشعار سوچ بچار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ھیں اور اُن کے تخیل کی بے باکی پر دال۔ ورنہ وہ تو خود کہتے ھیں ....

(رسالہ ادبی دنیا مئی ۱۹۴۵ء ص ۲۰)

اس موقع پر جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا میں نے جنس کا لفظ مباشرت کے معنوں میں قطعاً استعمال نہیں کیا اور اس گرمئی جذبات کو تخیل ہی کا اعجاز کہا ہے۔

جنس کا لفظ نفسیات میں جنسی فعل کے معنوں میں کبھی نہیں آتا۔ البتہ اس بات کا خالد صاحب کو گلہ اب بھی ضرور ہونا چاہئے کہ تخیل کی معجزہ کاری کو میں نے دسمبر ۱۹۰۸ء تک برقرار جانا ہے اور اس کے بعد کہیں بھی جنس کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

شیخ اکرام۔ شبلی نامہ میں (ص ۱۵۱) لکھتے ہیں:

اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر مسٹر عبدالوحید قریشی جنھوں نے شبلی کی حیات معاشقہ پر رسالہ کتاب بابت اپریل ۱۹۴۵ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے رقمطراز ہیں "جب مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا"

ہمارا خیال ہے اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاق شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے کئی چشموں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور اخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بہت سلجھ گیا تھا۔ لیکن ان کی ابتدائی تربیت اودھ پنچ اور پیام یار کے صفحات سے ہوئی تھی۔ اور یہ

اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا چنانچہ ذیل
کے اشعار سے شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر
جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں - ان
میں وہ فقط ہماری شاعری کی بعض سقیم اور مبتذل
روایات کو نباہ رہے ہیں ......"

یہاں فاضل معترض نے پیرے کا ابتدائی حصہ نقل کیا
ہے حالانکہ دیانت داری یہ تھی کہ سارا پیرا گراف
لکھا جاتا - اکرام صاحب نے جو اشعار پیش کرکے مجھ پر
الزام لگایا ہے اگر وہ غور سے دیکھیں تو مضمون کے اندر
ہی انہیں اس کا جواب مل جائے گا میرے اور
ان کے بیانات میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے - یہ
اشعار سارے کے سارے جن پر اپنے اعتراض کی بنیاد انہوں
نے رکھی ہے " دستۂ گل " سے مستعار ہیں اور" بوئے گل"
سے نہیں -

کچھ بحث کی ساری خرابیاں جنس کے لفظ سے پیدا
ہوئی ہیں - کیا اچھا ہو اگر معترضین Sex کے لفظ
کے لئے فرائڈ سے رجوع کریں کیونکہ اس کا صحیح مفہوم
نائٹ لٹریچر (Night Literature) میں نہیں بلکہ
نفسیات کی کتابوں میں ملے گا -

شیخ اکرام صاحب نے ص ۱۵۵ پر ارشاد فرمایا ہے :
ہمارے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کے اس اظہار
کو بغیر کسی تامل و تردد کے درست مان لینا

چاھئے - یہ صحیح ھے کہ خطوط شبلی اور غزلیات بمبئی میں ایک آگ بھڑکتی ھے - لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحب نے کوئی بھی کوشش کی تھی -"

ھم نے اپنے مضمون میں یہ کہیں نہیں کہا کہ عطیہ بیگم صاحب نے اس آگ کو شعلہ‌زن رکھنے کی کوشش کی - بلکہ ھمارا کہنا صرف یہ ھے کہ انھوں نے مولانا کو ۱۹۱۰ء سے پہلے تک Discourage نہیں کیا اور مولانا کو شاعری میں کھل کھیلنے کا موقع دیا - اشعار کی تشریح سنی اور نہ صرف ان اشعار کی شرح کو پسند کیا بلکہ اشعار کی داد بھی دی - اور اُس داد کو جواباً وصول بھی کیا جو شبلی نے ان کی داد پر دی - " ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ھوگا" اور پھر اسی خط میں "عطیہ بار بار جی چاھتا ھے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں سے بھیجوں کیا لکھنؤ میں کوئی چیز تمھارے قابل نہیں "

اب بتائے ھم یہ کیسے مان جائیں کہ عطیہ بیگم علامہ شبلی کی آتش عشق سے بےخبر تھیں۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتی ھیں :

"اب تھوڑا عرصہ ہوا میرے علم میں آیا کہ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا تھا - اور اسی میں بعض خطوط ایسے شائع کئے جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں - ان خطوں سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آگیا ہے - ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کئے گئے - اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی - البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے - مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم - ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں - جہاں بڑی عزت سے استقبال ہوتا ہے - لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں - جن کو ایسے راز دار دوستوں کے خطوں میں ظاہر کرتے ہیں جو مہذب تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لئے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی جو علم

واخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے
ہیں ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں
سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب
کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیار شرافت پر ان
عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟ ان کو اپنے دل پر
ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے تھا کہ اگر اُن کے
خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو
وہ ایسے خطوط کی اشاعت گوارا کرتے؟ انھوں
نے یہ بھی غور کیا ہوتا کہ خود مولانا شبلی
کے اخلاق کے متعلق دنیا کیا رائے قائم کرے گی
...... ہم نے ان کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے
تھے ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا ......
واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر
مبنی ہے کہ:
انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا
ہے لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی
نہیں معلوم ہوتی اور ہم اسی علم و لاعلمی
میں رہے

(ادبی دنیا جولائی اگست ۱۹۴۶ء)

اس اقتباس میں دلائل سے زیادہ جذبات کا استعمال
ہوا ہے۔ اور مولانا شبلی کی ذات پر بعض نازیبا اور ناواجب
حملے کئے گئے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی ضرور تھے لیکن

"خبیث" نہ تھے - باقی رہے سید سلیمان ندوی تو خطوط کی شاعت کی جتنی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اتنی ہی خطوط شبلی کی اشاعت سے امین صاحب پر ہوتی ہے - ہم نے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ اب کہتے ہیں کہ اس معاشقے میں عطیہ بیگم صاحبہ کا قصور تھا - خطوط و اشعار اکثر شبلی کی داخلی کیفیات ہیں ——— ہاں اتنا ضرور ہے کہ متذکرہ بالا اقتباس میں لاعلمی پر جو ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے ہمیں سوچنے پر ضرور مجبور کر دیتا ہے - اور ہم علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے ان جملوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جن میں عطیہ صاحبہ کو ذہین و فطین کہا گیا ہے -

امین زبیری صاحب جن کا شکریہ محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اپنے مضمون میں ادا کیا ہے - ان کی کتاب تبصرۂ حیات شبلی یعنی شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبد الماجد دریا آبادی مدیر صدق لکھتے ہیں -

> یہ تبصرہ شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو پیش کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن خود تبصرہ نگار کے مذاق طبیعت کی غمازی یقینا کر رہا ہے -

اسی طرح قاضی عبد الغفار مدیر پیام (مصنف لیلیٰ کے خطوط و مجنون کی ڈائری) اپنے فکاہی کالم میں رقمطراز ہیں:

، سرراہ ،

علی گڑھ کے کوئی محمد امین زبیری صاحب شاید وہی جنھیں ہم جانتے ہیں !! ان بزرگ نے ایک چو ورقہ (جس کی قیمت ۶ آنہ ہے) شائع فرمایا ہے - اس کا عنوان " تبصرۂ حیات شبلی " ہے اور اس عنوان کی توضیح یوں فرمائی گئی ہے کہ " یعنی مولانا شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو " - اس تبصرے میں حسن و عشق کے کچھ قصے مرحوم مولانا شبلی کی سوانح حیات سے منسوب کئے گئے ہیں ! علی گڑھ کے "بالشتیوں کی بستی" میں امین زبیری صاحب (اگر یہ وہی ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں) بہت بڑے سوانح نگار اور مورخ سمجھے جاتے ہیں - لیکن یہ ہمیں آج تک معلوم نہ تھا کہ اس چو ورقہ کی اشاعت کے بعد جس کی قیمت ۶ آنہ ہے ' اب تو ہمیں جناب زبیری صاحب کی عریانیات کا خیر مقدم کرنا ہی پڑے گا - !! کیا بہتر نہ ہوگا کہ مورخ علی گڑھ اپنی سوانح نگاری کے مساعی کو اپنے گھر کے قریب یعنی اپنے محلے ہی سے شروع فرمائیں ------ ہم انھیں بتاسکتے ہیں کہ اُن کی علمی کاوشوں کے لئے بہت کافی مواد علی گڑھ ہی میں موجود ہے ------ اگر یہ وہی زبیری

صاحب ہیں جنہیں ہم کسی زمانے میں ایک مصنف، اور مولف کی حیثیت سے جانتے تھے تو وہ بیچارے تو اب ایک ضعیف العمر بزرگ ہوں گے اس بڑھاپے میں حسن و عشق کی وقائع نگاری کا یہ شوق حسرت ناک ہے !!

.... تبصرہ نگار کے مذاق اور افتاد طبیعت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی بجائے ہم تو صرف اتنی بات عرض کریں گے کہ کیچڑ اور غلاظت کی سوداگری (چار ورق چھ آنے میں) ——— علی گڑھ کے ماحول میں ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ! "تاریخ بھوپال" اور "تذکرہ وقار" کے مولف کی یہ افتاد اگر ان کے ماحول کی بوڑھی رنگینئی افکار کا نتیجہ سمجھی جائے تو وہ ہماری رائے میں مذمت اور تنقید سے بالاتر ہے !!! گولر کی شاخوں میں انجیر کیوں تلاش کیجئے !! ——— ثقافت اسلامی (فی الہند !) کے مرکز پر جب اس قسم کی رنگینیاں ڈیڑھ آنے کے حساب سے بک رہی ہوں تو پھر ان پھولوں سے ہی اس چمنستان کی بہار کا اندازہ کرلیجئے !

زبیری صاحب کی روایت و درایت کا رخ ذرا بدل دیجئے تو یہ سلسلہ علی گڑھ کے کیسے کیسے مقامات 'علیا' تک پہونچتا ہے !! ——— جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔

(روزنامہ پیام ٦ جون ١٩٣٦ء)

یہ تو اچھا ہوا کہ گالیاں دینے والے ان علمائے کرام نے شبلی کی زندگی میں اس واقع کے ہونے کا اقرار کر لیا۔ میں ممکن تھا وہ اس سے بھی انکار کر جاتے۔ اب ممکن ہے کہ یہ لوگ شبلی کو صوفی ثابت کریں۔ اور ہم سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں۔ مولوی احمد مکی صاحب لکھتے ہیں :

"میں نہیں سمجھتا کہ حسن پرستی یا بالفاظ دیگر اچھی اور خوبصورت چیز کو بہ نظر پسندیدگی دیکھنا کونسی بری بات ہے۔ جو علامہ سلیمان اس طرح کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں۔
جبکہ خود ارشاد باری یہ ہے کہ اللہ جمیل و یحب الجمال اگر ہمارے خیالات میں پاکیزگی۔ ہماری روح میں صفائی اور ہماری نظر میں تقدس ہو تو حسن مجازی کے پردے میں حسن حقیقی کا پر تو دکھائی دیتا ہے اور جب جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو حقیقت منتظر لباس مجاز ہی میں دیکھنے کی تمنا ہوتی ہے۔ میں مولانا شبلی کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ان کی رنگین مجازی اور حسن پرستی کو ایک فعل محمودہ سمجھتا ہوں۔ اور اُن کا یہ ذوق لطیف ہی انہیں دوسرے ملانوں حتی کہ خود سلیمان

ندوی سے بھی ممتاز اور قابل عظمت بناتا ہے۔
میں یقین رکھتا ہوں کہ ان کی نگاہیں حسن
مجازی کے ظاہری عشوہ و انداز میں پھنس کر
معصیت عمل تو کجا معصیت خیال کی بھی
مجرم نہ بن سکی ہوں گی۔

(ہماری کتابیں اگست ستمبر ۱۹۴۶ء)

——— یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم۔
(وہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو
ان کے دل میں نہیں ہوتا)

ضمیمہ

عبدالرزاق مصنف البرامکہ کی یاد ایام کا مسودہ جب سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس پہونچا تو انہوں نے انہیں ایک خط لکھا - جو نگار اکتوبر ۱۹۴۵ء سے یہاں نقل کیا جاتا ھے اس خط میں مولانا کے آغاز شباب کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ھے یاد ایام (مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۶ء) میں ان کا سوائے آخری سطر کے کوئی سراغ نہیں ملتا :

۴۶ دارالمصنفین اعظم گڑھ مورخہ ۲۱ مارچ ۴۲ء

مکرم - السلام علیکم

یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں نہایت بے تکلفی سے بعض واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی آغاز شباب کے لئے ہوئے ہیں "دور جوانی افتد چناں کہ تو دانی" مگر اب وہ او اخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے تو ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نا مناسب ھے گناہ کا ستر چاھئے نہ کہ تشہیر - اس لئے از راہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی -

یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تاکہ اُن کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب وگناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں - والسلام

سید سلیمان

آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدردانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی بالکل غلط واقع ہے - غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے

ضمیمہ

مولانا (عرفان) آگے آگے تھے - میں پیچھے پیچھے - اب ہم ایک کشادہ اور شاندار ہال میں پہنچے - استقبال کے لئے سفید لباس میں ملبوس ایک کہن سالہ خاتون آگے بڑھیں بال سفید - چہرہ ضعیفی کا آئینہ دار - لیکن اداؤں میں شوخی - انداز گفتگو میں بیباکی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی انفرادیت - مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا "یہ خلافت کے ایڈیٹر جعفری صاحب!" پھر مجھ سے فرمایا "یہ ہیں عطیہ بیگم فیضی" عطیہ بیگم —— کتنا دل آویز نام اور اس نام کے ساتھ کتنی رنگین حکائتیں اور کتنی ہوشربا کہانیاں اور کتنی دلچسپ داستانیں وابستہ تھیں —— یہ بوڑھا مجسمہ جس میں آج نہ کوئی رعنائی ہے نہ زیبائی - نہ دلکشی ہے نہ سحرطرازی - اپنے زمانے میں کیا کچھ نہ تھا یہ بے رس آنکھیں جس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں - قتل عام شروع ہو جاتا تھا —— میں اپنے حافظہ پر تاریخ ماضی کے اوراق الٹ رہا تھا کہ عطیہ بیگم نے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا

علامہ شبلی کی حیات معاشقہ

" آپ تو آج پہلی بار ہمارے ہاں آئے ہیں - آئیے
میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں "

رئیس احمد جعفری

(دید و شنید ص ۵۷۲، ۵۷۳)